Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1960ء

FIELD MARSHAL MOHAMMAD AYUB KHAN *says* —

One of the main teachings of the Quran is that life is a process of progressive creation and each generation guided, but un-hampered by the work of its predecessors, must be permitted to solve its own problems. Iqbal, who has been one of the most enlightened interpreters of the spirit of Islam in the modern age, has truly said that the ultimate spiritual basis of all life is eternal and it reveals itself in variety and change. A society must possess eternal principles to regulate its collective life, because the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are understood to exclude all posibilities of change, which, according to Quran, is one of the greatest 'signs' of God, tend to immobilise what is essentially mobile in its nature. The failure of the West in political and spiritual fields illustrates the loss of its grip on eternal values; the weakening of the vigour of Islam during the last many centuries illustrates the effect of immobility.

(Revolution Day Message - 26th October, 1960)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

ہندوپاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے

غیر ممالک سے: ۱۰ شلنگ

قیمت فی پرچہ

ہندوپاکستان سے

بارہ آنے

ٹیلی فون: ۷۵۰۰

خط وکتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۔ لاہور

جلد ۱۳	نومبر سنہ ۱۹۶۰ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

لمعات		۲
صدر ایوب کی تقریر	(محترم کشفی صاحب)	۸
سفر نقیب بہار	(محترم ابوالعاکف صاحب)	۱۳ و ۲۸
ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	(محترم پرویز صاحب)	۱۷
قائد اعظمؒ	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۱
دنیا کی نجات	(محترم پرویز صاحب)	۴۵

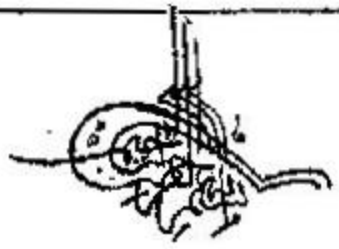

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے پاکستان ٹائمز میں (یروشلم سے آمدہ) حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"دی ورلڈ مسلم کانگریس" (غالباً مؤتمر عالم اسلامیہ سے مراد ہے۔ طلوع اسلام) نے (جس کا صدر مقام یروشلم ہے) صدر مملکت پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے اپیل کی ہے کہ وہ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی مملکت (MODEL MUSLIM STATE) بنا کر، عالم اسلامی کو اس کشمکش سے نجات دلانے کی قیادت حاصل کریں جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے۔ یہ اپیل اس خط کے ذریعے کی گئی ہے جسے کانگریس کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل، مسٹر کمال اشعری نے حال ہی میں صدر مملکت پاکستان کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔

خط میں لکھا ہے کہ پاکستان کا قیام نہ صرف برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے، بلکہ مسلمانانِ عالم کے لئے ایک اہم تاریخی واقعہ تھا۔ اسلامی دنیا اس وقت ایک آئیڈیالوجیکل بحران کی گرفت میں آچکی ہے مسلمانوں نے اپنا مقصدِ حیات فراموش کر دیا ہے اور اسلامی اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔ اب وہ دیگر اقوام عالم اور ان کی آئیڈیالوجی کے مقلدین کر رہ گئے ہیں۔ اندریں حالات یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی شخص اٹھے اور مسلمانوں کو اس کشمکش سے نجات دلا کر اس راستے پر ڈال دے جو انہیں ان کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اس اہم منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ آپ کو مسلمانوں کا کامل اعتماد حاصل ہے۔ آپ کی کامیابی کے لئے ان کی دعائیں اور تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ پاکستان کا آئندہ آئین اس قسم کا ہونا چاہیئے جس سے ایک حقیقی اسلامی معاشرہ متشکل ہو جائے۔ اس قسم کا اقدام اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ (بحوالہ پی۔ پی۔ اے)

اس خط میں جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ بڑا اہم ہے لیکن صاحبِ مکتوب کو غالباً اس کا علم نہیں کہ اس کا جواب بہت پہلے دیا جا چکا ہے

آج سے ٹھیک تیس سال پہلے (دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں) علامہ اقبال نے الہ آباد کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا کہ

میں ایک مستحکم اسلامی مملکت کا مطالبہ پیش کرتا ہوں۔ اس مطالبہ سے ہندوستان اور اسلام دونوں کا مفاد وابستہ ہے اس مملکت سے ہندوستان کے اندر جو طاقتوں کا توازن قائم ہوگا اس سے اسے امن اور تحفظ نصیب ہو جائے گا جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس مملکت کے قیام سے اسے اس بات کا موقعہ مل جائے گا کہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے جسے عربی ملوکیت نے اس پر لگا دیا تھا نیز اس سے وہ جمود ٹوٹ جائے گا جو اس کے ضابطہ قوانین، تعلیم اور ثقافت پر (صدیوں سے) چھایا ہوا ہے، اور وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ان چیزوں کو اپنی اصل سے قریب تر اور دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق کرے۔

اسی جواب کو قائد اعظم نے دہرایا تھا جب انھوں نے سنہ ۱۹۴۵ء میں کہا تھا کہ

مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں وہ اپنے ضابطہ حیات، ثقافتی نشو و نما، اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔

(فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس کی تقریر۔ مورخہ ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء)

چار سال پہلے (سنہ ۱۹۴۱ء میں) انھوں نے حیدر آباد (دکن) میں، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں" فرمایا تھا کہ

اسلامی مملکت کا یہ تصور ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم کے متعلق انھوں نے سنہ ۱۹۴۲ء کے پیغام عید میں کہا تھا۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے احکام صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الہیات سے نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ یہ ضابطہ حیات،

مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اس لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیے۔

اسلامی مملکت کا یہ تصور قائداعظمؒ کے ذاتی خیالات پر مبنی نہیں تھا۔ انہوں نے یہ تصور خود قرآن ہی سے لیا تھا جس نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴) اور جو اس (کتاب) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا (فیصلے نہیں کرتا) جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

قائداعظمؒ نے جو یہ کہا تھا کہ "قرآنی اصول ہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں" تو یہ اسلامی نظام سیاست کے ایک عظیم بنیادی اصول کی تشریح تھی۔ قرآن کریم زندگی کے ابدی اصول عطا کرتا ہے جو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دور کی ملتِ اسلامیہ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاملات کا حل آپ تلاش کرتی ہے۔ اس طرح ثبات و تغیر (PERMANENCE AND CHANGE) کے حسین امتزاج سے کاروان انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ مملکت پاکستان کے موجودہ صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، اسلامی نظامِ زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے واقف ہیں۔ ان کی طرف سے اس کا اظہار مختلف اوقات پر ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے، دسمبر ۱۹۵۹ء میں پاک جمہوریہ کے دورہ کے سلسلہ میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق بدلتے رہنا چاہیئے۔ (پاکستان ٹائمز، ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء)

جنرل ایوب کی تقریر

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، انھوں نے عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر جو تقریر نشر کی ہے، اس میں اس اہم بنیادی اصول کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا۔

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصر حاضر میں روح اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں

میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو حقاً متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد ہو کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ نو کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ صدرِ محترم نے، قرآن کی اس بنیادی حقیقت کو کس قدر واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ زندگی کے غیر متبدل، ازلی اور ابدی اصول، قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اس کا ارشاد ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۶/۱۱۵) اور تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہی وہ کلمات اللہ (قرآن کے اصول) ہیں جو "قائداعظم" کے الفاظ میں، ایک اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکتِ اسلامیہ اپنے دور کے تقاضوں کا حل تلاش کرتی ہے۔ اس باب میں وہ اپنے پیشروؤں کے خیالات و نظریات سے فائدہ اٹھاتی ہے لیکن وہ اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ وہ غیر متبدل نہیں ہوتے یہی وہ حقیقت ہے جسے صدرِ محترم نے (اقبالؒ کے الفاظ میں) یوں دہرایا ہے کہ

قرآن کریم کی اہم تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے۔ اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

ہمیں امید ہے کہ مسلم ورلڈ کانگریس کے ڈپٹی سکرٹری جنرل ہم سے متفق ہوں گے کہ وہی مملکت "ماڈل اسلامک اسٹیٹ" بن سکتی ہے جس کی عمارت ان بنیادوں پر استوار ہو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے جو کچھ کہا ہے صدرِ مملکت کی حیثیت سے کہا ہے، اس لئے ہمیں ایک مطمئن رہنا چاہیئے کہ (بتوفیق ایزدی) پاکستان ایک ماڈل اسلامک اسٹیٹ بن کر رہے گا۔ بالخصوص اس لئے کہ صدرِ مملکتِ پاکستان حسنِ اتفاق سے مردِ کار ہے، مردِ اقوال نہیں۔

صدرِ محترم نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سرِ نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیقِ پاکستان کے لئے وجہِ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ (ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دورِ غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے دان کی ہر شے اس میں دین بھی شامل ہے، نیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد مقالمکی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)۔

صدرِ محترم کا یہ مطالعہ و مشاہدہ یکسر حقیقت پر مبنی ہے۔ دین کا صحیح علم نہ مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں ہے نہ قدامت پرست مذہبی طبقہ میں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں ایسی بنیادی تبدیلی کریں جس سے "دنیاوی اور دینی" تعلیم کی موجودہ ثنویت ختم ہو جائے۔ دین کی تعلیم، ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا بنیادی جزو ہو اور اس طرح ہم اپنے نوجوانوں پر یہ حقیقت واضح کر سکیں کہ قرآن کے حقائق کس طرح دنیائے علم و فکر کی امامت کرتے ہیں۔ ہم صدرِ محترم سے گذارش کریں گے کہ انہوں نے جہاں مختلف شعبوں کی تحقیق و تجسس کے لئے متعدد کمیشن مقرر کئے ہیں، ایک کمیشن اس مقصد کے لئے بھی مقرر کریں۔ جو صحیح قرآنی تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کے لئے مناسب تجاویز پیش کرے۔

صدرِ محترم نے اپنی تقریر میں پارٹی سسٹم کو لعنت قرار دیا ہے۔ ان کی یہ تشخیص قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآن کی رُو سے، ملتِ اسلامیہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی (اُمت) ہے جس کے اندر پارٹیوں اور فرقوں کا وجود، شرک اور خدا کا عذاب ہے۔ قرآنی نظامِ مملکت میں پوری کی پوری ملت، بغیر پارٹی بنائے، مشترکہ طور پر شریکِ حکم ہوتی ہے اور باہمی مشاورت سے امورِ مملکت کو سرانجام دیتی ہے۔

صدرِ محترم کی زیرِ نظر تقریر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے یہ خیالات پاکستان کے مستقبل کے لئے نشانِ منزل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم اس مقام پر اپنے الفاظ کو دہرانا تحصیلِ حاصل نہیں سمجھتے جنہیں ہم نے (جنوری ۱۹۶۰ء کے طلوعِ اسلام میں) اس وقت لکھا تھا جب صدرِ محترم نے "پاک جمہوریہ" کے دورہ کے سلسلہ میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ ہم نے لکھا تھا کہ

مستحقِ مبارکباد ہے وہ انسان جس کے خیالات ایسے بلند اور جس کی آرزوئیں ایسی پاکیزہ ہوں اور در خورِ ہزار تبریک و تہنیت ہے وہ ملک جس کی سربراہی ایسے خیالات کے حامل انسان کے ہاتھ میں ہو۔

خدا کرے صدرِ مملکت کے یہ خیالات جلد از جلد عملی شکل اختیار کر لیں۔ اور ان کی یہ آرزوئیں محسوس پیکر میں سامنے آ جائیں۔

ورلڈ مسلم کانگریس کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل نے یہ بھی کہا ہے کہ مبداءِ فیض نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو ایک بلند مقصد کے حصول کے لئے منتخب کیا ہے۔ ہم نے اس حقیقت کو چھ ماہ قبل ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

آخر میں ہم جناب محترم المقام صدرِ مملکت پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گزارش کریں گے کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ..... اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہو گیا تو یقین مانئے، کہ آپ کا نام جریدۂ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخِ انسانیت آپ کو زمرۂ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی (۳۳/۴۳)۔ سابقہ اربابِ حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیشکش کی قدر نہ کی ... خدا کرے آپ اس میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے اس پر فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں۔ اور جب آپ بحضور داورِ داور جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے ترحیب و تہنیت کے پھول برسائے کہ

یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوتِ بازو سے زمانہ میں میرا سکہ رواں ہوا

(طلوعِ اسلام - مئی جون ۱۹۶۰ء)

اخیر میں ہم اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو کچھ صدرِ محترم نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے جب انھوں نے اسے عملاً متشکل کر دیا، تو مسلم ممالک ہی نہیں، بلکہ اقوامِ عالم کی امامت ان کے حصے میں آ جائے گی۔ اس لئے کہ دنیا (خواہ وہ روس ہو یا امریکہ، چین ہو یا برطانیہ) جس جہنم میں اس وقت مبتلا ہے اس سے نکلنے کی راہ قرآنی نظام کے سوا اور کوئی نہیں لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب ہم اس نظام کو اپنے ہاں نافذ کر کے، اس کے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج کو اس کی صداقت کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کریں ——— اور قرآنی نظام اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ

مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و احکام

کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ اور

کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔

صدر ایوب کی نشری تقریر

(محترم کشفی صاحب)

(واوین میں جو عبارت پیش کی گئی ہے وہ تقریر کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔)

دو سال کی مدت میں ہر اہم قومی تقریب کے موقع پر صدر ایوب نے ریڈیو پاکستان کی وساطت سے قوم سے خطاب کیا ہے۔ اُن کی تقریروں سے ہمیں اپنی حکومت کے ذہن، مزاج اور مستقبل کے لائحہ عمل کا ہمیشہ اندازہ ہوتا رہا ہے لیکن انقلاب کی دوسری سالگرہ کے موقع پر ۲۶ اکتوبر کو انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جو نکات پیش کئے ہیں اور جن مسائل کی نشان دہی کی ہے، اُن کی بنا پر ہم یہ توقع بلکہ یقین کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پاکستان کا آئندہ نظام اسلامی روح سے ہم آہنگ ہوگا اور قرآن حکیم کی اساس محکم پر تعمیر ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ صدر کے "لہجہ" نے یہ بات واضح کر دی کہ نعرہ بازی کا دور رخصت ہو گیا اور فکری دور اپنے تخلیقی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔

"نشریات" کے بارہ سالہ عملی تجربے اور نظری مطالعے کی بنا پر میں بڑے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ "آواز" انسان کی شخصیت ہوتی ہے۔ آواز کے دریچے سے کسی آدمی کی فکر، اس کی شخصیت اور اس کا ذہن جھانکتا ہے اور دوسروں سے ملتا ہے۔ آواز میں "لہجہ" کو بھی شامل کر لیجئے تو بات اور واضح ہو جائے گی۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جب محمد ایوب خاں نے سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں سے خطاب کیا تھا تو اُن کی آواز میں سنگینی اور لہجہ میں کرختگی تھی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو اُن کی آواز میں قطعیت اور ذمہ داریوں کے بوجھ کا پرتو تھا اور لہجہ میں فکر کی گراں باری تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ یہ آواز اور یہ لہجہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے لیکن یوں کہ انقلاب کے بنیادی عناصر برقرار رہیں —— زیادہ واضح الفاظ میں، بانی انقلاب کے نزدیک انقلاب اکتوبر کی

غرض و غایت ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کو غیر متبدل اصولوں (اسلامی آئیڈیالوجی) کی بنیاد پر متشکل کرنا ہے۔

انقلاب کی دوسری سالگرہ کے موقع پر صدر پاکستان کی تقریر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فلسفی مسائل کو ہنگامی مسائل پر ترجیح دی ہے۔ تقریر کا بڑا حصہ نظریہ پاکستان اور اسلامی آئیڈیالوجی سے متعلق ہے مسئلہ کشمیر کا تذکرہ انہوں نے بڑے واشگاف الفاظ میں کیا ہے لیکن اس طرح کہ اس کا سلسلہ بنیادی اصولوں سے جوڑ دیا ہے۔

اس تقریر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ کم سے وقت میں زیادہ سے زیادہ اہم باتیں کہی گئی ہیں۔ صدر ایوب الفاظ کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ الفاظ ہی تو ہیں جنہیں ہم مستقبل کا خاکہ، وعدہ اور عہد کہتے ہیں۔ تقریر کی ابتدا میں صدر نے ماضی کی کرب ناکیوں کی جگہ مستقبل کی امیدوں کو ہماری نگاہوں کا افق قرار دیا ہے "ایسا مستقبل جس کے مطالعے کے لئے محض مادی ترقیات ہی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں" "تنہا مادی ترقیات، انسان کو روحانی طور پر شرف انسانیت سے ہم کنار نہیں کرتیں۔ آج مغرب کا انسان چاند کو اپنا ہدف بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اپنے ہمسائے کی آنکھ کے آنسوؤں تک اس کی نظر نہیں جاتی اسی لئے اگر ہم زندگی کو انسانی سطح تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں زیادہ سے زیادہ وسیع، پاکیزہ اور جاودانی مقصد اور راہ تلاش کرنی ہوگی۔ اس اعلیٰ مقصد کے بغیر تمام مادی ترقی اور مادی خوشحالی سونے کے اس ڈھیر کی طرح ہے جو کوڑے کے نیچے دفن ہو یا اس بارش کی طرح ہے جو چٹانوں پر برستی ہے اور جس کے قطرے یوں ہی بہہ جاتے ہیں اور زرخیزی کا سبب نہیں بنتے۔"

قومی زندگی کا کوئی تصور اور خاکہ زندگی کے بارے میں واضح فکر اور بنیادی خیالات کے بغیر مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ ہم زندگی کی تعبیر جس رنگ میں کریں گے ہمارے ادارے، اجتماعی و انفرادی زندگی، اور ہمارا دستور اسی کے مطابق ہوگا، یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں اور ہمارے رہنماؤں کو زندگی کے حقیقی تصور کی تلاش میں تجربوں کے جنگل اور نظری مسائل کے بیابان میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن نے انسانی زندگی کی جو غیر متبدل قدریں عطا کر دی ہیں، وہ زندگی کے حسن کارانہ توازن، روش اور ارتقاء پذیر نظام کی اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ اپنی تقریر میں آگے چل کر صدر ایوب نے اسی حقیقت کو دہرایا ہے —— "خوش قسمتی سے ہمارے لئے زندگی کا یہ اعلیٰ مقصد اور راہ عمل "نظریہ اسلام" میں واضح طور سے موجود ہے" —— اسی مقام پر صدر نے یہ بات بھی کہہ دی ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی کو ذاتی اور سیاسی نعرہ کی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے جس نے اسے ایک "غیر مخلصانہ اور فرسودہ قول" میں تبدیل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اسلامی نظریہ حیات" کا نعرہ لگانے والوں میں سے یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ "معاشرہ کو از سر نو اسلام کی بنیاد پر متحد کیسے کیا جائے۔"

معاشرہ کو اسلامی بنیاد پر قائم کرنے کی جد و جہد سے پہلے ہمیں دو قسم کی داخلی قیود سے اپنے ذہنوں کو آزاد کرنا

ہوگا"۔ ان دونوں قسموں کی وضاحت اور حد بندی صدر ایوب نے بالکل درست کی ہے۔ پہلی قسم تو وہ ذہنیت ہے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر اپنی روایات اور دین سے بہت دور ہو گئی ہے اور جن کے نزدیک دین اس دور میں "فیشن ایبل" چیز نہیں ہے — یہ گروہ ہماری نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں —

دل توڑ گئی ان کا صدیوں کی غلامی
دارو کوئی ڈھونڈو ان کی پریشان نظری کا

اور یہ دارو سوائے اس نظام تعلیم کے کچھ اور نہیں ہو سکتا جو قرآنی خطوط پر تشکیل کیا جائے گا۔ صدر ایوب نے قومی و اسلامی مقاصد کی تکمیل اور حصول کے لئے نظام تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے، چنانچہ اپنی تقریر میں آگے چل کر انہوں نے کہا ہے کہ — "یہ مقصد اس وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب ہم اسلام کے حسن سے آشنا ہوں اس کے معاشرتی مقاصد پر عمل پیرا ہوں اور ایسا صحت مند نظام تعلیم قائم کریں جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں"۔ — اس جملہ سے ذہن کو بڑا سکون ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر پاکستان کے نزدیک تعلیمی کمیشن کی سفارشات محض نقطہ آغاز ہیں (ان سفارشات کا بیشتر حصہ انتظامی امور اور تعلیمی اداروں کی ساخت سے متعلق ہے) اور اس باب میں مستقبل کے تقاضوں کے مطابق ترقی و تبدل کی راہیں کھلی ہیں۔

میں ذکر کر رہا تھا ان دو قسم کی قیود کا جن سے ذہنوں کو آزاد کرنا ہے۔ دوسرے گروہ کا ذکر صدر محمد ایوب خاں نے ان الفاظ میں کیا ہے — "دوسرا گروہ اُن جامد عقائد کی پیداوار ہے جس نے اسلام کی روح کو تعصب، توہم، ضعیف الاعتقادی اور گھٹن کے گڑھے میں پھینک دیا ہے، مقید کر دیا ہے" — اس گروہ سے صدر ایوب نے "ملت کے غیر تعلیم یافتہ طبقوں" کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن عوام سے پہلے اس گروہ میں خود ہمارے علمائے کرام بھی تو شامل ہیں، اور ذہن انہیں کی طرف خود بخود متوجہ ہوتا ہے کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ملائیت کی پیداوار ہیں اور ملائیت جامد عقائد و اوہام کا مجموعہ۔

تقریر کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں صدر مملکت پاکستان نے مستقبل کے طریق کار کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسلام کے موقف کو علامہ اقبال کی ذہنی رہنمائی میں بڑی قوت سے پیش کر دیا ہے۔

— "قرآن کی اہم تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ زندگی ترقی پسندانہ تخلیق کا سلسلہ ہے اور ہر نسل کو اپنے پیش روؤں کی رہنمائی میں اپنے مسائل حل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے، لیکن پیش رو کسی رکاوٹ کا سبب نہ بنیں" — یہ بات بڑی اہم ہے۔ ہم بد قسمتی سے ایک ایسی ملت بن گئے ہیں جو قرآنی تعلیمات پر اسلاف کے افکار اور اپنے پیش روؤں کے خیالات کو ترجیح دینے لگے ہیں اور یہ بات بھول گئے ہیں کہ

"تغیر و تبدل زندگی کی اساسی اور کلیدی خصوصیت ہے — فطرت کا تقاضہ ہے کہ انسان تغیر کا ساتھ

دے یا پھر فنا ہو جائے۔ اقبال نے جو عہدِ حاضر میں، روحِ اسلام کے بہترین اور حد درجہ بالغ نظر شارحین میں سے ایک ہیں، سچ کہا ہے کہ حیاتِ کُل کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے اور اس کی نمود تغیر و تبدل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لئے اس کے پاس ازلی و ابدی (غیر متبدل) اصول ہوں۔ کیونکہ یہی غیر متبدل اصول ہر آن بدلنے والی اس دنیا میں وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر ہم اپنا پاؤں ٹکا سکیں لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے اللہ کی عظیم آیات میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی جس کی فطرت متحرک ہے یکسر جامد اور ٹھٹھری ہوئی بن کر رہ جائے گی۔"

اقبال کے حوالہ ہی سے صدر ایوب نے یورپ کے سیاسی و عمرانی انتشار اور گذشتہ صدیوں میں اسلام (یعنی مسلمانوں) کے جمود کا ذکر کیا ہے ——— اقبال کے الفاظ صدر ایوب کی زبان سے ——— ع

ہوئے فکر و عمل پہلو بہ پہلو

آیئے ہم سب مل کر اس خوش بختی پر اپنے آپ کو مبارک باد دیں۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی بنیاد پر اسلامی مملکت کا کاروبار سرانجام پاتا ہے۔ صدر ایوب کا ہر لفظ، ہمارے مستقبل کے لئے ایک وعدہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ اس شخص کا وعدہ ہے جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے کی قوت اور اہلیت رکھتا ہے۔

صدر ایوب کی تقریر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اجتماعی ذمہ داروں کے ساتھ ساتھ انفرادی حقوق اور ذمہ داریوں پر یکساں زور دیا ہے ——— "آپ بینک سے اس سے زیادہ روپیہ نہیں نکال سکتے جتنا آپ نے جمع کرایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ملک سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے جتنا کہ آپ نے اس کی تعمیر کے لئے کیا ہے"۔ بات صحیح بھی اور درست ہے ——— لیکن بینک کی مثال نے اسے اگر ایک طرف عام فہم بنا دیا ہے تو دوسری طرف اس کی معنویت کو محدود کر دیا ہے۔ اسلام اس باب میں ہمیں بہت آگے لے جاتا ہے۔ اسلام کی رُو سے ہم دوسروں سے جو کچھ لیتے ہیں اُس سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور ہم جو کچھ دوسروں کو اور معاشرہ کو دیتے ہیں اس سے ہماری ذات ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی حیاتِ جاوداں کی طرف جادہ پیما ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں بینک میں زیادہ سے زیادہ جمع کرنا چاہیئے۔ اور نکالنا صرف اپنی کم از کم ضروریات کے لئے چاہیئے تاکہ بقایا نوعِ انسان کی عالمگیر نشو و نما کے کام آ سکے۔

اس تقریر کے کئی اور پہلو تبصرہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً فنی و عام تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی و روحانی تربیت، وضعداری کا دیانت دارانہ طرزِ عمل، مختلف راہوں اور سرگرمیوں میں رابطہ، اور "(ہم) بدعنوانی کو ترک کر دیں اور اگر ممکن ہو تو دوسروں کو اس میں مبتلا ہونے سے روکیں"......... یہ نکتہ "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی

نشتریح ہے۔ بلکہ حقیقی اسلام میں، اگر ممکن ہو تو، کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ بات تو جماعت مومنین کا نشان بن جاتی ہے

اس تقریر کی ایک اور اہم بات "پارٹی سسٹم کی لعنت" سے بیزاری کا واضح اظہار ہے ——— سیاسی فرقہ بندی ہی نہیں کہ مغرب کی عطا کردہ لعنت ہے بلکہ اسلام کی ہئیت اجتماعیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ———

آخر میں صدر ایوب نے مسئلۂ کشمیر کا ذکر کیا ہے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اور بڑی وسیع النظری کے ساتھ۔ ایسی فکری تقریر کے پس منظر ہی میں مسئلہ کشمیر کے حقیقی خدوخال اُجاگر ہوسکتے ہیں کشمیر ہمارے لئے اپنی مملکت کی حدود کو وسیع بنانے کا حیلہ یا وسیلہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ابدی اور مستقل قدریں وابستہ ہیں۔ کسی کو دوسرے انسانوں کا محکوم نہیں بنایا جاسکتا، کشمیریوں کو آزادی سے زندہ رہنے کا ویسے ہی حق ہے۔ جیسے کسی اور قوم کو اور ہم "قلت وسطیٰ" ہیں جو دنیا کی ہر قوم سے یکساں فاصلے پر ہے ——— ہم نے اپنے آپ سے اور کشمیریوں سے جو عہد کیا ہے، وہ بہر قیمت پورا کیا جائے گا ———

سیکولر حکومتوں کے عہد میں صدر ایوب کی یہ تقریر ایک اسلامی (دینی) مملکت کے قیام کی بشارت ہے۔ اور یہ بشارت امن عالم کے قیام کی ضمانت بن سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سیکولر حکومتوں کی پالیسی وقت کے تقاضوں یا افراد کے بدلنے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، یہاں کسی غیر متبدل اصول کا سوال نہیں ہوتا ——— اسی لئے جب ایک فرد کی جگہ دوسرا فرد یا ایک جماعت کی جگہ کوئی دوسری جماعت عنان اختیار ہاتھ میں لیتی ہے تو ساری دنیا ایک عجیب کش مکش کے عالم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کہ نہ جانے نئی حکومت کی عام پالیسی اور دوسروں سے اس کا رویہ کیا ہوگا؟ اسٹالن کی موت کے بعد روس کی آئندہ پالیسی ساری دنیا کے لئے کتنی غیر یقینی تھی۔ امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخابات کی طرف دنیا کی نگاہیں کیوں مرکوز ہیں؟ اسی عدم یقین کی بنا پر ———

اس کے برعکس ایک دینی (اسلامی) مملکت کی بنیاد غیر متبدل اور ابدی اقدار حیات پر قائم ہوتی ہے۔ یہ اقدار وقت اور مفادات کے ساتھ بدلتی نہیں۔ اسی لئے دینی مملکت کے بارے میں ہر فرد اور ہر قوم یقین سے کہہ سکتی ہے کہ، افراد آئیں اور افراد جائیں، حکومتیں بنیں اور حکومتیں ٹوٹیں، فلاں معاملہ میں اس مملکت کا رویہ اور ردِ عمل بہر حال یہ ہوگا؛ اور یہ مملکت ان اصولوں اور اقدار کی بہر قیمت پابندی کرے گی۔ یہ یقین امن عالم کی دائمی ضمانت بن سکتا ہے۔

اس اعتبار سے صدر مملکت کی یہ تقریر، پوری دنیائے مغرب کے نظام حکومت کے خلاف کھری تنقید اور اسلامی نظام کی رفعت و عالمگیریت کا واشگاف اعلان ہے۔ دوسری طرف یہ تقریر ان نام نہاد مسلم ممالک کے سیاسی نظام کے خلاف بھی چیلنج ہے جو شریعت کے نام پر غیر قرآنی عناصر (مثلاً موروثی ملکیت۔ نسلی مفاخرت یا غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت) کو اپنے ہاں رائج کرکے، اسلام کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

سفر نقیبِ بہار

(بزمِ طلوعِ اسلام کے ذیلی کنونشن اور پرویز صاحب کے مختصر دورۂ کراچی کے تاثرات)

از

ابوالعاکف

آمدہ "ساقی" و ہمراہِ "بہاراں" آمد　　　ابرِ باراں ز "لطف" بہ گلستاں آمد
ساقیا! جام بدہ ابرِ خراماں آمد　　　موجِ بوئے گلِ نو رستہ ز بستاں آمد

——— سلیم اللہ فہمی

حیدرآباد، بابُ الاسلام کراچی کی آغوش سے بہت دور نہیں ——— یہ شہر میرے لئے اجنبی بھی نہیں - میرا اس کا رشتہ بہت پرانا ہے ——— اس رشتہ کی وہی عمر ہے جو میری نئی زندگی کی ہے، جو نوخیز مملکت پاکستان کی ہے ——— اس شہر کے مکانوں کے بادکش دور سے فضا میں پھیلے ہوئے اور اوپر کی طرف منہ اٹھائے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے آسمان سے سرگوشی کر رہے ہوں ——— اس کی اونچی نیچی سڑکوں اور گلیوں میں مجھے ہمیشہ لکھنؤ اور آگرہ کے تنگ کوچوں کا عکس دکھائی دیا ہے - اس شہر کی سڑکوں پر چلتے چلتے کبھی کسی بلند پیشانی، ستواں ناک اور عقابی آنکھوں کو دیکھ کر میں یوں چونک چونک پڑتا ہوں جیسے محمد بن قاسم کی فوج کا کوئی سپاہی میرے قریب سے گذر گیا ہو ——— شہر میں داخل ہوتے ہی یہاں کا قلعہ اپنی تاریخ کی کہانیاں سنانے لگتا ہے - یہ

شہر جو جہاں سوز صدیوں کا فرکار رہ چکا ہے ہمارے مستقبل کا ایک حسین گہوارہ بنتا جا رہا ہے ــــ غلام محمد بیراج نے یہیں سندھ کے لئے شادابی کا سرچشمہ ہے ــــ کنواری بانجھ زمین کی کوکھ سے گندم کے خوشے پھوٹ نکلے ہیں۔

میں بارہا حیدر آباد آیا ہوں۔ لیکن اس بار میرا سفر کچھ اور ہی مفہوم رکھتا تھا ــــ ۱۵ اکتوبر کو ایک پرانی موٹر میں، میں اور انور صاحب بزمِ طلوعِ اسلام کے سب کنونشن میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے مغربی افق کی حسین لالی، اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھی ؎

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

اور پھر تاریکیاں چھا گئیں۔ حیدر آباد ابھی بیس میل دور تھا کہ موٹر کی روشنی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب جنگل تھا، تاریکی تھی اور موٹر تھی لیکن تاریکی اور جنگل ہماری راہ کیسے روک سکتے تھے۔ ہم دوسری گاڑیوں کی روشنی میں آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتے رہے۔ اچانک ایک موٹر سے ایک گاڑی اُبھری ہمارے قریب آکر ٹھہری اور ایک آواز سنائی دی "ہم کم رفتار سے آپ کے آگے آگے چلتے ہیں، آپ ہماری روشنی میں چلتے رہئے"۔ سفر پھر جاری ہو گیا اور میں تمثیلات کی دنیا میں کھو گیا۔ یہ پرانی موٹر ہماری ذہنی اور قومی کیفیت کی علامت ہے۔ یہ تاریکی، ہمارے ماحول، ذہنی پراگندگی اور نظری انتشار کا آئینہ ہے۔ دوسری گاڑی کی یہ روشنی جیسے مستقل اقدار کی روشنی ہے، نظامِ کامل کی روشنی ہے جس کے سہارے ہم اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ اور حیدر آباد آگیا۔

ساڑھے سات بج چکے تھے۔ رات پونے آٹھ بجے دونوں مسافر ایکی بسنٹ ہال پہنچ گئے۔ پرویز صاحب کی پہلی تقریر "وحدتِ ملت" شروع ہو چکی تھی۔ اُن کی آشنا اور مستحکم آواز کان کے راستے دل کی گہرائیوں میں اُترنے لگی۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ دروازوں میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ برآمدے کی کرسیاں پر ہو چکی تھیں۔ سامنے کے باغیچے کی نشستوں پہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں برآمدے کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔

پرویز صاحب قرآنِ کریم کی روشنی میں اپنے موضوع کا عالمانہ تجزیہ کر رہے تھے "آج کا انسان بین الاقوامیت کے دور سے گذر کر عالمگیریت (UNIVERSALISM) کے عہد کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس عالمگیر برادری کی بنیاد کیا ہو؟ اس کا جواب مغرب کے پاس نہیں۔ مغرب کے مفکر ان بنیادوں کو تلاش کر رہے ہیں مگر گوہر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ سچ پوچھئے تو عقلِ محض، عالمگیر برادری کی بنیاد تلاش نہیں کر سکتی۔ یہ بنیاد وحیِ الٰہی نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانیت کو عطا کی تھی۔ یہ بنیاد ہے تکریمِ انسانیت۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ "ہم نے انسان کو بحیثیت انسان کے واجب التکریم بنایا ہے"۔ ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے مستحقِ تکریم ہے۔ اس انسانی تکریم کے ساتھ ساتھ نظریاتی وحدت، عالمگیر برادری کے قیام کی بنیاد ہے۔ اسلام نے شعوب و قبائل، رنگ و نسل، جغرافیائی اختلافات . . . . غرض کہ ہر ایسی چیز کو مٹا دیا جو انسانیت کو حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کرتی ہے

اور یہ وحیِ الٰہی قرآن کی صورت میں ہمارے لئے محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی"۔

ان بنیادوں کی تشریح کے بعد پرویز صاحب نے فرمایا کہ ملتِ اسلامیہ نے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اسی عالمگیریت کے دائرہ کو وسیع تر بنایا مسلمان تو امتِ وسطیٰ تھے۔ ایسی قوم، جو دنیا کی ہر قوم سے یکساں فاصلے پر تھی۔ اس ملت کا مقصد انسانوں کو نظریاتی وحدت کے ذریعہ امتِ واحدہ بنانا تھا۔

اور پھر پرویز صاحب کی آواز میں آنسو لرزنے لگے۔ عام آدمیوں کی آنکھیں روتی ہیں چمن کے شیرازہ بندوں کی آواز روتی ہے۔ تقریر کے اس مرحلہ پر پرویز صاحب نے مسلمانوں کے اختلافات کا تذکرہ بڑی دردمندی کے ساتھ کرتے ہوئے بتایا کہ وحدتِ ملت ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ مسجد اللہ کا گھر ہوتی ہے۔ یہ ہماری عبادات بلکہ قومی و اجتماعی زندگی کا محور ہے لیکن جب ایک مسجد (مسجدِ ضرار) کے قیام کا سبب یہ بات ٹھہری کہ ملت میں افتراق و انتشار پیدا کیا جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد ہی کو ڈھا دیا۔ اور قرآن نے اسے ایک عظیم کارنامہ قرار دیا۔

"برادرانِ عزیز! آج انسانیت ہماری طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور ہم انسانیت کو مایوس نہ کریں گے لیکن انسانیت کو عالمگیر برادری بنانے سے پہلے ہمیں اپنے اختلافات مٹانے ہوں گے۔ ہمیں ایک بار پھر امتِ واحدہ بننا ہوگا۔ اس کے لئے دل و نظر کے زاویے بدلنے ہوں گے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اور پھر

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا"

پرویز صاحب کی تقریر کے بعد صدرِ جلسہ علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی نے مختصر سی تقریر کی۔ اس تقریر کے ہر لفظ میں بڑی قوت اور وحدتِ ملت کی آرزو تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے کہا کہ میں اس مجمع کے سامنے اپنی ذاتی شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مردِ درویش (جو آج کی نشست کا مقرر ہے) پچیس تیس برس سے مسلسل قرآن کی آواز بلند کر رہا ہے۔ ایسی آواز جو کسی اور جگہ سے ہمارے کانوں میں نہیں پڑتی لیکن قوم ہے کہ جاگنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کے بعد انہوں نے وحدتِ ملت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ میری آپ سے ایک ہی نصیحت ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ شخص جس قرآنی طریق کی آپ کو دعوت دے رہا ہے، اگر آپ نے اس کا اتباع کر لیا تو آپ کو موجودہ مصائب سے نجات مل جائے گی۔ قرآنی راستے کے علاوہ نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔

علامہ قاضی کا اس سرزمین کے رہنے والوں کے دل میں جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ان پرشکوہ اور پرخلوص الفاظ نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

پرویز صاحب کی تقریر ختم ہو گئی، لیکن ذہن قرآن کے رُخ پر مُڑ گئے۔ یہ حیدرآباد میں اُن کی پہلی تقریر تھی۔ اس سے

پہلے وہ یہاں کبھی نہ آئے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اُن کے اجتماعات کی مخالفت نہ کی جائے کہیں یہ نہ ہو کہ سننے والوں کی تعداد بہت کم ہو۔ لیکن اپنی بسنٹ ہال پہنچ کر یہ سب اندیشے باطل خیالات کی طرح مر گئے۔ قرآن کی آواز دل کائنات کی دھڑکن بنتی جا رہی ہے۔ کاش! پرویز صاحب نے اپنے قیام کراچی کے دوران کبھی اس خطہ کی طرف توجہ دی ہوتی۔ اس "کاش" کی تکرار سے اُس رات میں پریشان ہو گیا تھا۔

تقریر کے بعد سب کنونشن کے مندوبین و مبصرین کراچی ہوٹل میں رات کے کھانے کے لیے جمع ہوئے۔ یہاں مجھے لمبی لمبی نورانی ڈاڑھیوں والے وہ دو بزرگ نظر آئے جنہیں بسنٹ ہال میں دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ جلسے کے بعد یہ دونوں کوئی ہنگامہ ضرور پیدا کریں گے مگر معلوم ہوا کہ یہ تو سب کنونشن کے مندوبین ہیں۔ نظام بخش صاحب اور یار محمد خان صاحب، جو دس گھنٹوں کا سفر طے کر کے ڈیرہ اسماعیل خان سے آئے تھے اور خوشحال خان خٹک کی شاعری کے دو کردار معلوم ہو رہے تھے۔ میں ان کی میز پر بیٹھ گیا۔ مجھے صدر صاحب (خان جمال بخت) کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، اور عجیب نظام بخش صاحب میرے لیے اُن کا بدل (لو نعم البدل نہیں) بن گئے۔ میں نے اپنی بات اُن سے کہہ دی۔ وہ ہنس پڑے، اُسی طرح جیسے سچا پٹھان ہنس سکتا ہے۔

دوسرے دن یعنی ۱۶ اکتوبر کو بزم طلوع اسلام کا سب کنونشن مولانا عبدالرب صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ مندوبین اور مبصرین کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ اس بار کی روئداد میں بھی مجھے غالب کا یہ مصرع اُبھارنے کی اجازت دے دیجئے

ع سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

حافظ برکت اللہ صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کی۔ آیات ربانی کا اعجاز ہی تو ہے کہ ذہن اپنے گرد حصار کھینچ لیتا ہے اور وہ شیاطین سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مرزا خلیل بیگ صاحب نے کلام اقبال کو اپنے لحن سے حاضرین کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پہنچا دیا۔ بارہا کی سُنی ہوئی غزل آج اپنی معنوی گرہیں کھول رہی تھی۔ معنوں کی تہیں اُبھر رہی تھیں۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی — ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و مُلا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اُڑا لی کس نے — عقل کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کا کلام، زندوں کی محفل ہی میں اُن سے خطاب کر سکتا ہے۔ یہ خلوت کی شاعری نہیں، یہ تو ان ہنگاموں کو جنم دیتی ہے جو گلستان کی حیثیت کو بدل دیتے ہیں۔

مرزا خلیل بیگ کی نغمہ سرائی بزم طلوع اسلام کے سالانہ اور ذیلی اجتماعات کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ اور اقبال کی نظم پڑھنے سے آدمی خود بھی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اُن کی آواز کا سوز اُن کی شخصیت کا تعارف ہے۔

اس کے بعد باہمی تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں اس سے پہلے کبھی کسی کنونشن میں شریک نہ ہوا تھا، اسی لیے اس رسم

(باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے)

باسمہٖ تعالیٰ

آج سب سے اہم سوال یہ ہے کہ

ہم میں کیرکٹر کیوں نہیں؟

اس سوال کا اطمینان بخش جواب

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

آپ کسی سے بات کیجئے، اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصلِ گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں۔ پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں۔ اہلِ محلہ میں کیریکٹر نہیں۔ کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم و نسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں۔ کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخر الامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض، اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے تعمیریات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے، اور ہر قلبِ حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی جھٹکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر نہیں

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اس شرح و بسط سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ مشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا۔ وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی مثل اس کے سامنے ہو اس کے متعلق یہ پہلے پتہ لیتا ہے کہ اس نے پچھلے الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؛ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے۔ لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION) بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے

لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREY KIERKE GARRD) کے نزدیک

اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔

(THE PERESENT AGE)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے۔ اور

جب ظاہر (APPRARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔

(ADVENTURES OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔

خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات کا بگولے کا سا رقص۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

بارٹویلو کے نزدیک "اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے"۔ اس کی تائید (ALEXANDAR LOVE DAY) بھی کرتا ہے۔ (TEINER) کا قول ہے کہ

انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHERACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟

مال صدقہ جان

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ـــــ مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو ـــــ اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے۔ یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہے تو اس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے ـــــ یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے ـــــ تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ نہ ہی اُس شخص کے متعلق جو جان

دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لیا ــــ اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا ــــ سول سرجن نے مریض کو دیکھا، مرض کی تشخیص کی، پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیاں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا۔ باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے دوائیاں نہ خرید لینا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کریا کرم (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا۔ ادھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں سے جو طریق سستا ہو اُسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنیے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بے وقوف تھا۔ جان کی حفاظت (PRESERVATION OF SELF) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر (BY INSINCT) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ ننھی سی جان ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے راستے میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے؟ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے تو اس میں بلندیٔ اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی کا ایک جبلی جذبہ کا مظاہرہ ہے۔ جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے جو اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اُسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقہ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی "جان صدقہ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آ جائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے۔ جب ان دونوں میں سے صرف ایک کو بچایا جا سکے تو پھر انسان کو چاہیئے کہ جان دیدے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کے لئے جان دیدیتا ہے۔ ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو جانے دے اور اپنی جان بچا لے اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو انسان (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصور سے بھی آشنا نہیں ہوتے یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ اس کا تعلق شرفِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے

کیریکٹر کی تعریف

جو شخص جان دے کر شرفِ انسانیت کو بچا لیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اقدار

اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دے دینے والا صاحبِ کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت و عصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دے دی تو اس سے عفت و عصمت ہی مقصود ہوتا ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بد باطن کسی شریف زادی کے برقعے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کے گولی مار دے گا۔ خواہ اس کے لئے اسے پھانسی

آبرو کا معیار

کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے ـــ لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے، اس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی۔ بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہر دلعزیز (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انسانی اقدار ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے دوسرے معاشرے میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف

اقدار مختلف ہیں

ہوگا اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ لیکن ایسے قبائل بھی گزرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو چرا کے لے جاتے اور ترستان کے باشندوں کو گولی سے مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں بھی ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحر الکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جن کے نزدیک بد دیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے۔ جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ منگولوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُر فریب طریق پر قتل کر ڈالے۔

---

[1] "انسان نے کیا سوچا" ص ۱۳۲

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلمہ انداز سیاست (اجتماعیت) ہے۔ اس مسلک کی رُو سے جو شخص دوسری قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچاتا ہے وہ سب سے بڑا محب وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسمے نصب کئے جاتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ NIEMELIN کے الفاظ میں یہ ہے کہ

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی وسعت کی نشو ونما ہے لئے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز ہے۔[1]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ

(۱) کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا۔۔۔ لیکن

(۲) یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا اس تصور کی رُو سے دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے اُن اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنھیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے اس لئے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پاجاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تو محرمین سے مواصلت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

قرآنی نقطۂ نگاہ یہ ایک نقطۂ نگاہ ہے۔ یعنی ایک بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے، اس کا ارتکاب قابلِ نفرت مستوجب سزا ہے۔ جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث ہے نہ موجب عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طریق معاشرت، انداز بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں۔ اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردوبدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ انھیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے "تقویٰ" کی جامع اصطلاح

---

[1] "انسان نے کیا سوچا؟" صفحہ ۱۹۵

سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالم اخلاقیات راشڈل (HASTINGS RASHDAL) کے الفاظ میں

> اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے۔ جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔ (THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL II P. 286)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے۔

> اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔ (ایضاً صفحہ ۲۱۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE) سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجئے۔ قرآن اسے "حیوٰۃ الدنیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے (لفظ دنیا کے معنی قریب تر کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رُو سے ان لذات کا حصول کوئی بُری چیز نہیں وہ انھیں وجہ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں (TIE) پڑتی ہے۔ اُس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسانی قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔

اسے کیریکٹر کہیں گے

مثلاً قرآن کریم میں ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ اس کے لئے کسی معاملہ میں اگر تمہیں گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے وہ امیر ہے یا غریب۔ قانونِ خداوندی امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ اور چارہ ساز ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب سے زیادہ ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے یا دولتمندی کی محبت کا خیال تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پرواہ مت کرو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات

بات کو یونہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو! اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔" آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (ٹکر) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لئے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہے۔ اس کے برعکس، مفادِ خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر دامن گیر رہتا ہے کہ اگر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا۔ وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کشمکش میں جو شخص ان طبیعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے، یا شہادت دینے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اس کا کیریکٹر پست ہے (قرآن اسے اتباعِ ہویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ ہویٰ کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے)۔ لیکن جو شخص ان تمام میلانات و عواطف کو نظرانداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

انسان ایسا کیوں کرے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبیعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبیعی تقاضوں میں بڑی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی، عزت اور نام کی شہرت، بلند مناصب و مدارج، قوت، اقتدار، حکومت۔ ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں، انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذات و حظوظ کو قربان کر دے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع و لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔[1] وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پرواہ نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ جسمانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلہ میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لئے کرتا ہے — بلکہ اس سے بھی زیادہ — اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ کر پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

---

[1] مفادِ خویش کا تحفظ درحقیقت جذبۂ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کی شاخ ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً اسے اٹھا کر پھینک دے گا۔ وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں سمجھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں ذرا سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا اسے اٹھا کر باہر پھینک دے گا! وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کر لے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آیئے کہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کیا جاتا ہے اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سلسلہ اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، مذہب پرست انہیں چھوڑ دیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔

ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر "مذہب پرست"[1] یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا جب اس کا ذہن ہنوز عہد طفولیت میں تھا۔ لیکن اب یہ جواب اس کے لئے وجہ طمانیت نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں، اس کے لئے آمادہ بھی ہو جائے تو بھی اس کے دل میں اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے، اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب اس مقصد کے حصول کے

---

[1] اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا۔

لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

مفکرین کا طبقہ دوسرا طبقہ مفکرین کا طبقہ ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے؟ اس کے متعلق بہت سے مفکرین مغرب کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کر دیں تو مقصد پیش نظر کے لئے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ ارباب فکر سے پوشیدہ نہیں۔ کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

> اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیر محض کہا جا سکے، سوائے نیک ارادے کے۔

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINITION) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ

> وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔

یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہو کر فرض کو محض فرض سمجھ کر ادا کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصور شامل ہو جائے وہ عمل، عمل خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عمل خیر کی بنیت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل میں آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک، اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادہ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور وہ دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادۂ عمل کریں۔ ان کا نام، اس کی اصطلاح میں (A PRIORI MAXIMS) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امر غیر مشروط (CATIGORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے

> امر غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے لئے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے، نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے "فرائض" ہونے کے لئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے (A PRIORI کے یہی معنی ہیں) اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسی چنگاری پیدا نہیں کر سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بہت بڑے جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان "مفاد خویش" کے خیال سے کبھی بے نیاز

نہیں ہو سکتا۔ یہ ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس میں لئے اپنا فائدہ نظر نہ آسکے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفر کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا ارباب تصوف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو مفاد خویش سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے۔ زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رُو سے زندگی کے دو نظریے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے۔ اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے جسے موت کہتے ہیں۔ اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور زندگی کے مطابق انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین و ضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُسے پُر امن شہری کہا جاتا ہے جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے

(۱) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین و ضوابط مناسب سمجھے وضع کرلے۔ اور جب چاہے ان میں تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کرلے۔

(۲) ان قوانین و ضوابط کے اتباع کے لئے جذبہ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا

(۳) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کرلے کہ وہ ان قوانین کی خلاف کرے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا مواخذہ کرے تو پھر ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(۴) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفاد خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رَو میں بہ نکلے (جیسا کہ ہمارے ہاں تقسیم ہند کے بعد ہوتا رہا) تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افراد قوم کو اس لوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبہ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گزر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصور ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب بن رہی ہیں۔ اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ اپنے جہنم میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی ان سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINITION) کی رو سے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدہ کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ عقلمندی کہیں گے، کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی)۔

دوسرا تصورِ حیات

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب کا بیان۔ قرآن کی رو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس کہتے ہیں۔ قرآن اسے روحِ خداوندی (DIVINE ENERGY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے چونکہ اس کی نشوونما کے لئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشوونما ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصۂ آدم کے حسین تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو! یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی تو دیکھئے کہ وہ بیٹے کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میری

طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا نام و نشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسانہ ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے اولاد کی اپنی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ انسان کو حیاتِ جاوید، انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ اس نے انسان کی اس عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کی بر آوری کے لئے یہ طریق بتایا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما جسم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو اس کے اندر مضمر حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کرلے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ اسی طرح انسانی جسم اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعے ملی ہیں جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں، اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصورِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں جو مادی تصورِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) مادی تصورِ حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی اور قوانین اور اقدار۔ لیکن

(۲) قرآنی تصورِ حیات کی رو سے انسانی جسم اور اس کے تقاضے مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ بلکہ بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

(۳) قرآنی تصورِ حیات کی رو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے

اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضے اور مستقل اقدار کے تقاضے) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحبِ عقل دوسرے ذریعے کو بچانے کے لئے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا تو اس لئے کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی خاطر، ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(۱۰) قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضے اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضے کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل قدر کے تحفظ میں انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو، عقلِ خود بیں۔ اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو عقلِ جہاں بیں کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیوٰۃ الدنیا) کے مفاد، اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوا الالباب کہہ کر پکارتا ہے یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(۱۱) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ خود انسان کی عقل کا تقاضہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفاد خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطح زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے۔ انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

(۱۲) جو کام عقلِ خود بیں کے تقاضے سے کیا جاتا ہے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقلمندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقلِ جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقلمندی اور کردار (دونوں) کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جب تک انسان (ان نظریاتِ حیات) پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ

ایمان کی ضرورت

(۱) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصودِ زندگی ہے۔

(۲) ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے۔ ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اس وقت تک اس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرفِ انسانیت سے ہے۔

مارشڈل لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

(۱) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی۔ بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

(۲) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

(الف) ایک مستقل حقیقت ہے

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔ یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(۳) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا کل ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ ہیش یا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں۔ اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل النفس مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً صفحات ۱۲۳-۱۲۲)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے پہلے "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آ جائیے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں ـــ اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے ـــ ایک کاروباری آدمی کچھ خلافِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کر لے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے لیگا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے ـــ

شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لئے کہ اسے دیانت داری میں ہی فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اسکی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے اور چونکہ اس کی نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال دونوں میں زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس

مفاد اور مفاد میں فرق

ایمان سے انسان کے مفادِ خویش کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کا جذبۂ محرکہ بھی مفادِ خویش ہی کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لئے کم فائدے سے صرفِ نظر کر کے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیشکش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا حکم ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا ــــ جس طرح زہر آلود دیا ہوا کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا۔ اسے قرآن کی رو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک مردِ مومن حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے عمل کا صلہ یا معاوضہ طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (۱۰/۷۲) سے یہی مراد ہے[1] عمل کوئی بھی ہو وہ بلاصلہ یا بلامعاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنی محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں۔ اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے (قرآن نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق بتایا ہے)۔ ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی فراوانی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ کا یہی مطلب ہے۔

سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کما لے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو آجکل روس میں پیش آ رہی ہے اور اسے اپنی سرحدوں پر آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔

روس کی مشکل

اس سوال کا جواب صرف قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ ــــ

(۱) انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے۔ اور

(۲) ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کر دے۔

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر تڑپ ہوتی ہے ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہو تاکہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔ لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے تو وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں، اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور «یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ» (۵۹/۹) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں

فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ

عملی طریق

سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فردِ معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔ معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں[1]) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں یہ فاضلہ دولت نہ کسی کے پاس رہتی ہے نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصورِ حیات پر

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دے دے۔ یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہتے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصورِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔ کمیونزم جس تصورِ حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطحِ زندگی قرار دیتا ہے۔ جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصورِ حیات کی رُو سے مادی مفاد سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ

نیشنلزم کا جذبہ

زیادہ سے زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار کر، افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریۂ جمہوریت کی رُو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبۂ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آگئی تو طاقتور قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی، اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی

---

[1] وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع ہی سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنی چاہیئے۔ تحفظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظِ خویش کے لئے لابدی ہے۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظِ خویش کے لئے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقلمندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھا ہوا کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے، اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔ (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقلمند کہا جائے گا) صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کود جائے۔ اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس و شعور بھی نہیں ہوگا لیکن بایں ہمہ وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہو سکتی ہے۔ کمیونزم یا کسی اور ازم کے بس کی بات نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے

مردِ مومن کا جذبۂ تحفظِ وطن

اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو اس لئے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہو جائے گا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کا تحفظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت و استحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبۂ تحفظِ وطن اور ایک مومن کے جذبۂ تحفظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؟ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔

لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ و تنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہو جاتا ہے۔ جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔

خلاصۂ مبحث

جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) جب انسان کی طبعی زندگی سے متعلق دو اقدار میں تصادم ہو، تو جو شخص زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمت والی قدر کو قربان کر دیتا ہے اسے عقلمند کہا جاتا ہے۔

(۲) جب کسی طبعی مفاد یا تقاضا اور انسانی قدر میں تصادم ہو تو اس وقت اگر انسانی قدر کو طبعی تقاضا پر ترجیح دی جائے تو اسے کیریکٹر کہتے ہیں۔

(۳) اس سے ظاہر ہے کہ کیریکٹر کا مظاہرہ اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو انسانی اقدار اور انسانی ذات پر یقین رکھتا ہو۔ واضح ہے کہ چونکہ یہ شخص بھی درحقیقت زیادہ قیمتی قدر کی خاطر کم قیمتی قدر کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ بڑا عقلمند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مومنین کو اولوا الالباب کہا ہے یعنی صاحبانِ عقل و بصیرت۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح عقل و بصیرت کے مالک یہی لوگ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتے وہ انھیں "دیوانہ" سمجھتے ہیں۔

(۴) انسانی اقدار، عقلِ انسانی (یعنی معاشرہ) کی پیداوار نہیں ہو سکتیں۔ یہ صرف وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں اس لئے انسانی اقدار پر وہی شخص ایمان رکھ سکتا ہے جسے وحی پر ایمان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان اور عمل صالح کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔

(۵) یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وہ بعض انسانی اقدار کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان کے تحفظ کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں انسانی اقدار بطورِ روایت چلی آتی تھیں اور ان پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح ان اقدار کا علم اور احترام ان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکا تھا ——— لیکن اگر ایسی صورت نہ تھی تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ان کی اس قسم کی قربانی کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا ——— مثلاً نام اور نمود کی

خواہش، شہرت کی آرزو، یا کوئی اور مفاد۔ اس لحاظ سے ان کی اس قربانی کو کیریکٹر نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ کیریکٹر کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے طبعی تقاضوں کی تسکین مقصود نہ ہو۔

(۶) انسانی ذات کی نشوونما، ان تمام اقدار پر یقین، ان کے احترام اور تحفظ سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ان میں سے بعض کو چھوڑ دینے اور بعض پر عمل کرنے سے نہیں ہوتی۔

(۷) انسانی ذات کا نشوونما ایک معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔ خلوت کی تجرد گاہوں میں نہیں۔ اس معاشرہ کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ جس کی عمارت، قرآن کی مستقل اقدار کے ایمان پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی اقدار کا تحفظ اس مملکت کا فریضہ اور دنیا میں ان کا عام کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ اس نظام میں افراد مملکت کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور انھیں دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

تصوف اور قرآن

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ تصوف کے پیش نظر بھی تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں خلوت کدوں کی انفرادی ریاضت سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ اندریں حالات انسان، ایک معاشرہ کے قیام اور مملکت کی تشکیل کے لئے کیوں سر کھپائے؟

یہ سوال بظاہر بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تصوف اور قرآن دونوں کی تعلیم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تصوف کی ماہیت کے متعلق میں دوسرے مقام* پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس تفصیل کو یہاں (ضمنی طور پر) دہرایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے یہاں صرف چند اصولی باتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان پر غور کرنے سے حقیقت سامنے آجائیگی۔

(۱) یہ سمجھنا غلط ہے کہ تصوف کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام ہے۔ تصوف کی رو سے انسانی ذات (خودی) کا وجود تمام مصیبتوں کی جڑ ہے اور اسے مٹا دینے کا نام نجات ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی ذات، ذات خداوندی کا جزو ہے۔ جو اپنے اصل سے الگ ہو کر، مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اسے اس دلدل سے نکالنا تاکہ یہ پھر اپنے اصل سے مل جائے، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اور یہ چیز ترک دنیا، ترک علائق اور ترک خواہشات سے حاصل ہوتی ہے۔ فنائے ذات، نہ کہ ذات کا استحکام، تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) تصوف کی رو سے، معاشرہ، مملکت، نظام سب دنیاداروں کے دھندے ہیں۔ تزکیۂ نفس کے لئے ان سے الگ رہنا ضروری ہے۔ انسانی نجات کا حصول (یعنی روح کو مادہ کی دلدل سے نکالنا) ایک انفرادی فعل ہے جو مختلف قسم کی

---

* سلیم کے نام خطوط، جلد سوم

ریاضتوں، مراقبوں، اور چلّوں سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) تصوف میں صرف منفیانہ خصائص (NEGATIVE VIRTUES) کو حسنِ عمل قرار دیا جاتا ہے ــــ نفیٔ ذات کے لئے اعمال بھی منفیانہ ہی ہونے چاہئیں ــــ عاجزی، مسکینی، انکساری وغیرہ۔ اقبالؒ اس ضابطۂ اخلاق کو "راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم۔ از گروہ گوسفندانِ قدیم" کا ایجاد کردہ مسلک گوسفندی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک افلاطون

گوسفندے در لباسِ آدم است ۔۔۔ حکم اُو بر جانِ صوفی محکم است

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ تصوف کو "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" قرار دیتا ہے۔ قرآن تسخیرِ کائنات کا درس دیتا ہے اور دنیا میں نظامِ عدل کے قیام کو مقصودِ زندگی بتاتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں انسان کی ذات کی نشوونما ممکن ہے اور کیریکٹر نشوونما یافتہ ذات کی مختلف شیوؤں (FACETS) کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح ہیرے سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں اسی طرح نشوونما یافتہ ذات سے کیریکٹر کی نورانی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اسی کو قرآن نے صبغۃ اللہ (خدا کا رنگ) کہکر پکارا ہے۔ خدا کا رنگ صرف اس معاشرہ میں نکھرتا ہے جو قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار کا ضامن ہو۔ اور جس میں ہر فرد عقل وبصیرت کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے، مستقل اقدار کا تحفظ کرے۔

ضرورتِ رشتہ: پنجاب کے ایک ۲۴ سالہ دیانتدار محنتی قبول صورت اور گریجوایٹ مسلم نوجوان کے لئے جو کراچی میں تین سو روپے ماہوار پر ملازم ہے۔ ایک قبول صورت، شائستہ، باشعور اور گریجوایٹ دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔ حسبِ ذیل پتہ پر خط وکتابت کیجئے۔

ح ۔ معرفت طلوعِ اسلام ۔ گلبرگ ۔ لاہور

کراچی کے دوستو!

آؤ! اور ہر اتوار کی صبح نو بجے، سندھ اسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بات ــــ مفکرِ قرآن کی زبان سے

ــــ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے زیرِ اہتمام

عصرِ حاضر کی بے مثال تصنیف

اِنسان نے کیا سوچا؟

از:- **پرویز**

پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین!

"فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اندازِ تحریر ایسا سلجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔"

(روزنامہ 'نوائے وقت'، لاہور)

"مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرینِ عالم کے خیالات کو ترتیب دے کر ایک واضح تصویر پیش کی ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے، اور فاضل مصنف کے تبحرِ علمی کا ثبوت۔"

(ہفت روزہ 'قندیل' لاہور)

ٹائپ کی حسین طباعت۔ سفید کاغذ۔ جلد مضبوط ۔۔ گرد پوش دیدہ زیب

قیمت:- ۔۔۔۔ بارہ روپے ۱۲/-

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ طلوعِ اسلام** ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔۔ لاہور

"لغات القرآن"

کی

دوسری جلد شائع ہو گئی

لغات القرآن کی پہلی جلد گزشتہ اپریل میں پیش کی گئی تھی۔ الحمد للہ کہ اب اس کی دوسری جلد بھی چھپ گئی ہے

دوسری جلد قریب ساڑھے پانسو صفحات پر پھیلی گئی ہے اس میں ح سے ش تک کے الفاظ آگئے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

خدا سے محبت کا مفہوم۔ حرام و حلال کی تفصیلی بحث۔ حسن کیا ہے اور احسان کسے کہتے ہیں؟ حشر کے معنی کیا ہیں؟ محصنات کون ہیں؟ حق و باطل کیا ہے؟ حکمت کسے کہتے ہیں؟ حکومتِ خداوندی سے مقصود کیا ہے؟ محکمات و متشابہات کی تفصیلی بحث۔ حمد اور تعریف میں کیا فرق ہے؟ حمدون سے کیا مراد ہے؟ حیات و ممات۔ ختم نبوت۔ خشیت الٰہی۔ کیا آدم خلیفۃ اللہ ہے؟ خمر و میسرہ۔ خوف و حزن۔ عملِ خیر کسے کہتے ہیں؟ دابۃ الارض کیا ہے؟ المدثر کا مفہوم۔ دعا سے کیا ہوتا ہے؟ دلوک الشمس سے کیا مراد ہے۔ دین کیا ہے؟ دنیا سے کیا مراد ہے؟ کیا بنی اسرائیل کے بچے سچ مچ ذبح کر دیئے جاتے تھے؟ ذکرِ خداوندی سے کیا مفہوم ہے؟ مذہب سے کیا مراد ہے؟ رب العالمین کیا ہے؟ ربٰو کی بحث۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" کے معنی کیا ہیں؟ رحیم و رحمٰن میں کیا فرق ہے؟ رسول کسے کہتے ہیں؟ مرشد کون ہو سکتا ہے؟ "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کے معنی کیا ہیں؟ حضرت عیسٰیؑ کے رفع الی السماء سے کیا مراد ہے؟ رکوع و سجود سے مقصود کیا ہے؟ روح کی بحث۔ المزمل کی تشریح۔ تسبیح سے کیا مراد ہے؟ سحر (جادو) کیا ہے؟ سدرۃ المنتہیٰ سے کیا مراد ہے؟ اسلام کسے کہتے ہیں؟ سموات سے کیا مراد ہے؟ قصۂ آدم میں شجرہ سے کیا مطلب ہے۔ شریعت کسے کہتے ہیں؟ شرک کیا ہے؟ شیطان کی حقیقت کیا ہے؟ شعور۔ شوریٰ قرآن کی رو سے۔ شفاعت کا کیا مطلب ہے؟ شکر کسے کہتے ہیں؟ مشیتِ خداوندی کیا ہے؟ (تقدیر کا تفصیلی بیان)

قیمت - پندرہ روپے ——— محصول ڈاک ایک روپیہ

فرمائشیں جلد بھیجئے :———

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷- بی ——— شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

(مسلسل)

قائدِ اعظمؒ

(۳)

اسلامی مملکت اور قرآنی نظام کا نقیب

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، بالفاظِ دگر قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ (قائدِ اعظمؒ)
>
> (حیدرآباد دکن میں چند سوالات کے جواب میں — اگست ۱۹۴۱ء)

تحریکِ آزادیٔ ہند اور ہندو مسلم اتحاد کی پچیس سالہ جدوجہد میں قائدِ اعظمؒ نے جس مثالی کردار کا مظاہرہ کیا اس کی تفصیلات اشاعتِ ماسبق میں سامنے آچکی ہیں۔ ۱۹۳۷ء تک ان عظیم الشان مساعی میں ان کی تمام سعی و کاوش کا مرکز و محور یہ رہا کہ کانگرس و مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ پلیٹ فارم تعمیر کیا جاسکے جو غیر ملکی سامراج کے لئے ملکی اتحاد کا ایک مستقل چیلنج ثابت ہو اور پھر دو قوموں کے باہمی اتحاد کی اس عظیم قوت سے غلامی اور محکومی کے وہ بندھن توڑے جاسکیں جنہوں نے کروڑوں انسانوں کے شرفِ انسانی کو داغدار اور ان کی توانائیوں کو مضمحل کر رکھا تھا۔ اتحاد و آزادی کی ان شبانہ روز کوششوں میں سالہا سال تک ان پر ایسا جنون سوار رہا کہ ملکی اخبارات نے یہ شہادت دی کہ

مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کبھی اکتاتے نہیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ | لیکن کیا انجام ہوا ان مسلسل اور جان توڑ مساعی کا ؟ تاریخِ آزادی کے اوراق

پوری وضاحت سے اس سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ کانگرس کا مہاسبھائی ذہن قدم قدم پر ان حقائق قدامی کے خلاف برسرِپیکار رہا۔ اس کے یہ ناپاک عزائم اور منحوس سازشیں کبھی ماند نہ پڑ سکیں کہ برطانوی سامراج کی جانشینی کے لئے رام راج کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے اور انگریز کی غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹتے ہی اس برصغیر کی پوری آبادی کو اشوک کے چکر اور پراچین تہذیب و تمدن کی ان زنجیروں میں جکڑ دیا جائے جن کی جمہوری قبا اپنی نمائشی اور پرفریب چمک دمک سے نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہو۔

میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء قائدِ اعظم کی کاوشِ اتحاد کا عظیم شاہکار تھا اور مہاسبھائی سازشوں نے اسے جس حسرت و یاس کا نشانہ بنایا اس کی المناک داستان آج شرمندہ بیان اور روکشِ تشہیر نہیں رہی۔ آزادی و اتحاد کی اس مخلصانہ سیاسی جنگ میں مہاسبھا اور ستیہ گرہ کی بوالعجبیوں کو جس گہری چال سے بروئے کار لایا گیا اور ہر فیصلہ کن موڑ پر گئو رکھشا کی تحریک جس طرح بلاوجہ اور اچانک طور پر ابھر کر منظرِ عام پر آتی رہی۔ بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس اور کلکتہ کی آل پارٹیز نیشنل کنونشن کو ناکام بنانے کے لئے جس قسم کے افسوسناک ہتھکنڈے حرکت میں لائے گئے۔ اور پھر پہلی گول میز کانفرنس میں جو منافرت انگیز ڈرامہ کھیلا گیا یہ تمام سلسلہ دراصل اس حقیقت کا کھلا کھلا اعلان تھا کہ ان تلخ اور ناکام تجربات کو مزید جاری رکھنا سیاسی تدبر اور مومنانہ فراست کے لئے کوئی خوشگوار اور نیک فال ثابت نہیں ہوگا۔

انقلابِ عظیم

۱۹۳۱ء کے آغاز میں پہلی گول میز کانفرنس جس بُری طرح ناکام ہوئی اس کے تلخ ترین انجام سے محمد علی جناح جیسے صاحبِ عزم سیاستدان کے ذہن میں جو سوال ابھر سکتا تھا اور یقیناً وہ ابھرا وہ یہی تھا کہ اب کیا ہو؟ یہی ہے سیاسیاتِ ہند کا وہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ جہاں سے جناح کی تگ و تاز ایک عظیم فکری و نظری انقلاب کی روشنی میں ایک نیا موڑ مڑتی ہے ـــــ وہ انقلاب جس نے ایشیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا اور عالمِ اسلام کو ایک نئی صبحِ بہار کی تابناکیوں سے لذت شناس کیا۔ یہی انقلاب تھا جو تحریکِ پاکستان کا پس منظر قرار پایا اور اسی تحریک کے آغاز سے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ جدوجہد حاصلِ تکمیل کو پہنچی جس کے برگ و بار مملکتِ پاکستان کے محسوس و مشہود پیکروں میں کشتۂ زارِ سیاست کا شاہکار قرار پائے۔

فکر و نظر کا یہی انقلاب ہمیں اس مقام تک لے آیا ہے جہاں تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر نجومِ سحر کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے جگمگا اٹھتے ہیں اور سرزمینِ مشرق کی اس عظیم ترین اور انقلاب آفریں تحریک کا قافلہ سالار کاروانِ ملت کو اپنے جلو میں لئے فاتحانہ شان سے قدم بڑھاتا نظر آتا ہے۔ بڑا ہی نازک تھا یہ مرحلہ اور بڑی ہی صبر آزما تھی یہ منزل۔ تین صدیوں کی مسلسل بے حسی، سیاسی زوال اور ذہنی شکست کے بعد اس برصغیر کی ملتِ اسلامیہ وحدتِ فکر و عمل سے ہم آہنگ اور احساسِ خودی کے ولولوں سے سرشار ہو کر والہانہ انداز سے کارگہ سیاست میں صف آرا ہوتی ہے اور دس سال کی مختصر سی مدت میں اس کی فاتحانہ معجز نمائیاں ایک اذانِ انقلاب

بن کر سیاسی فضاؤں میں گونج اٹھتی ہیں۔

تحریک پاکستان کا منتہا و مقصود

کیا تحریک پاکستان کی یہ داستانِ انقلاب دو سیاسی پارٹیوں کی باہمی چپقلش کے نام کے مترادف تھی؟ کیا یہ سب کچھ کسی فرقہ وارانہ یا انتقامی روش کی ردیدہ ہے جو جناح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کانگرس کے خلاف بروئے کار لائے؟ کیا یہ کوائف شاطرانِ فرنگ کی طے شدہ کرشمے تھے؟ تاریخ کے بین السطور سے جو حقائق اُبھر کر سامنے آتے ہیں وہ پکار پکار کر صاف اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر رہے ہیں کہ ایسا قطعاً اور ہرگز نہ تھا۔ بلکہ یہ تصادم تھا زندگی کے دو مختلف تصورات کا۔ یہ آویزش تھی دو متضاد نظامہائے حیات کے تقاضوں کی۔ یہ ٹکراؤ تھا دو جداگانہ ثقافتوں کا۔ یہ جنگ تھی دو قوموں کے متخالف رجحانات کی۔ یہ انقلاب آفریں معرکہ آرائی تھی دین و وطن کے دو متقابل خداؤں کی۔ اور زیادہ واضح الفاظ میں یہ فیصلہ کن محاربۂ عظیم تھا۔ جمہوریت کے مغربی اور اسلامی نظریات اور فلسفہ ہائے زندگی کا۔ اس محاربۂ عظیم کا انجام یا تو مشرق میں اسلام اور اس کی عالم آرا اقدارِ حیات کی نشاۃ ثانیہ کا آئینہ دار بن سکتا تھا اور یا پھر بصورتِ دیگر (خاکم بدہن) ان عالمگیر تصورات کی موت جن کی کارفرمائیوں سے اسلام نے اس برصغیر کے دامن کو اپنے بیش بہا لعل و گہر سے مالا مال کر دیا تھا۔

اس مرحلہ پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ تحریک پاکستان سے متعلقہ حالات و کوائف اور اس باب میں قائد اعظم کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل پیش کرنے کے بجائے ان تصورات کو منظر اشاعت پر لائیں جو تحریک پاکستان کا اصل الاصول ہیں۔ اور نظریات و تصورات کے اس بنیادی اختلاف کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کریں جن کی بنا پر اس برصغیر کی تقسیم ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر معرضِ وجود میں آئی۔ تحریک پاکستان کا منشاء و منتہیٰ کیا تھا؟ قائد اعظم کن ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لئے دو عظیم طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے تھے؟ ان عظیم قربانیوں کا پیش نہاد کیا تھا جن کا سامنا ہر ان کٹھن منزلوں میں کرنا پڑا؟ یہ ہیں وہ اہم ترین مسائل جن کے حقیقی حل سے مملکتِ پاکستان کی تقدیرِ حیات وابستہ ہے اور جسے نظر انداز کر کے اس وفائے عہد کا امکان قطعاً پیدا نہیں ہو سکتا جو اس مملکت کے معماروں کے لئے مقدس ترین فریضۂ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی وہ نقطۂ ماسکہ ہے جس کے محور پر پاکستان کی تقدیر گردش کرے گی اور یہی وہ نظریاتی اساس ہے جس سے ہمارے مستقبل کے ایوانوں کی تعمیر ہوگی۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی تحریک کے بنیادی مقاصد اور منتہیٰ کو جانچنے کے لئے عظیم ترین اور قابلِ وثوق شہادت اس کے قافلہ سالار کے اعلانات قرار پاتے ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ صورتِ حال کے وہ کون سے تقاضے تھے جن کی تکمیل کے لئے اس تحریک نے جنم لیا۔

وہ کون سی وحدتِ فکر و عمل تھی جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو ایک مسلک تنظیم میں منسلک اور ایک منزلِ مقصود پر جادہ پیمائی کی محرک ثابت ہوئی۔ پاکستان کے بہترین مفاد اور شفاف مستقبل کا تقاضا یہی تقاضا یہی ہے کہ ہم تحریک پاکستان کے

ان تاریخی حقائق کو روشنی میں دیکھیں جو اس تحریک کے قائد جلیل کے قلب و نظر میں ابھرے اور پھر اس کے کاروانِ شوق کے لئے دعوتِ سفر قرار پا گئے۔ زیرِ نظر اشاعت میں ہمیں حیاتِ قائد اعظم کے انہیں حیات آفریں کوائف کی وضاحت مقصود ہے۔

ہمارے سامنے قائد اعظم کی زندگی کی وہ تصویر آچکی ہے جب سنہ ۱۹۳۱ء کے آغاز میں پہلی گول میز کانفرنس کے حسرتناک انجام نے ان کے عزم و استقلال کی ساری توانائیاں مضمحل کر کے رکھ دیں۔ اور وہ لندن کے ایک گوشۂ تنہائی میں مایوسیوں سے نڈھال ہو کر وقفِ سکون ہو گئے۔ جس زعیمِ سیاست نے پوری زندگی میں مایوسیوں اور نامرادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا قبول نہیں کیا تھا وہ ہیجان و اضطراب کی اتھاہ تاریکیوں میں امید کی ایک ایک کرن کے لئے ترس رہا تھا۔ اضطرابِ افکار کے اس ہجوم میں اس کے کانوں نے پہلی بار ایک دانائے راز اور حکیمِ انقلاب کی قلندرانہ پکار کو سنا اور اس کے فکر و نظر کے تاریک گوشے ایک درخشندہ حقیقت کی تابانیوں سے جگمگا اٹھے۔ یہ اقبالؒ کی آواز تھی جو گنگ و جمن کے سنگم سے فضائے ہند میں ترشح ہو رہی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (سنہ ۱۹۳۰ء) کی مسندِ صدارت سے دینِ خداوندی کا یہ نقیب مخصوص حسنِ انداز سے ملت کی نشاۃِ ثانیہ کے سبز عظیم کی نقاب کشائی کر رہا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یہی وہ خطبۂ صدارت تھا جو قائد اعظم کے ملی سفر کے لئے بہت جلد نشانِ منزل قرار پا گیا اور اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلامیانِ ہند کی منزلِ مقصود متعین کر دی۔ جناح نے اس آواز کو سنا جو بانگِ رحیل اور اذانِ سحر بن کر گونج رہی تھی۔ کچھ مدت تک اس نے کاروانِ ملت کے سفر کا نقشہ ترتیب دیا اور پھر وہ فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ اپنے کاروان کو لئے ہوئے سرگرمِ سفر ہو گیا۔

اذانِ سحر

آئیے! اس مقام پر چند لمحے رک کر اس اذانِ سحر کی صدائے بازگشت کو فردوسِ گوش بنائیں جو حسبِ ذیل اعلان سے منزل کا سراغ دے رہی تھی ۔۔۔ حکیم الامتؒ نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔

> ہندوستان کی تاریخ میں جو نازک وقت مسلمانوں پر آج آچکا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملتِ اسلامیہ اور ہندوستان، دونوں کے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس ملک کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کے فیض سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین کے ساتھ ہماری زندگی اور موت وابستہ ہو چکی ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک فریضہ عاید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر ایشیا اور بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ مسلم ایشیا کے تمام ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لیے

اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلے کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے ہی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت وحیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ہم ان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو۔ اور اس کے حصول کے لئے ہم منظم طور پر عزم نہ کریں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم، متحد اور ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن سے ہماری ملت کی زندگی اور موت وابستہ ہے بری طرح اثرانداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتے کے بارے میں ناامید نہیں ہوں لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔ ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تلی بیٹھی ہوں۔ (بحوالہ طلوع اسلام - مارچ ۱۹۳۹ء)۔

اور پھر انہوں نے منزل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور اس زندہ و پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے جو وہ پیش کرتا ہے نور بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سر نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

اسی خطاب میں ان کے محبوب تصورات بشدتِ آرزو کے ساتھ یوں لبوں تک آ گئے۔

میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کی ان آرزوؤں کی بنیاد اس حقیقت کبریٰ پر تھی کہ اسلام میں قومیت کی اساس وطن کے اشتراک پر قائم نہیں ہوتی بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک پر۔ اور اس آئیڈیالوجی کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنے بنیادی اصول اور مستقل اقدار کو ایک زندہ نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے ایک خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسی خطبہ میں واضح کیا کہ

اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ...... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ (ایضاً)

اسی جداگانہ مملکت کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ اُنھیں بھی کہیں اپنی نشوو ارتقا کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر اُنھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ (ایضاً)

ملت اسلامیہ کی قیادت

یہ تھا وہ خطبۂ صدارت جس نے محمد علی جناح کے افسردہ و پژمردہ افکار کو نئی امید کی روشنی عطا کی۔ اور ۱۹۳۵ء میں جب وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور اس کے ہولناک نتائج سے اپنی ملت کو بچانے کے لئے لندن سے واپس پہنچے تو انھوں نے آتے ہی آمدہ کر دہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر منظم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

۱۹۳۷ء کے آغاز میں نئے انڈیا ایکٹ کے تحت کانگرس کو سات صوبوں کی وزارتوں پر مسلط ہونے کا موقع مل گیا اور نشۂ اقتدار کے اس نئے نئے سرور میں کانگرسی کارفرماؤں نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ اقبالؒ کے خطبہ صدارت کے یہ الفاظ ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آ گئے کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔ (خطبۂ صدارت علامہ اقبال بمقام الٰہ آباد ۱۹۳۰ء)

اقتدار کے اسی نشے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے اجلاس میں بڑے طمطراق سے یہ کہا۔

ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو قوموں اور ملتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

یہ مرحلہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں بڑا ہی نازک مرحلہ تھا۔ ان کی کیفیت ان بکھرے ہوئے موتیوں کی سی تھی جنھیں ایک سلک تنظیم میں پرونے کا کام ابھی بمشکل شروع ہوا تھا۔ لیکن قائد اعظم جس عظیم جیش نہاد کے نقیب بن کر اُٹھے تھے اس کی روشنی میں انھوں نے پوری قوت سے اس چیلنج کا جواب دیا اور واضح کیا کہ مسلمان

واقعی ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم کے افراد ہیں۔ اور یہ واضح کرتے ہوئے انہوں نے لکھنؤ کے خطبۂ صدارت (۱۹۳۷ء میں) اپنی ملت سے یہ درد بھری اپیل کی کہ

> مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو از سر نو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت صرف ایک ہی چیز انہیں یہ سہارا جہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم اور بلند تصورِ حیات کا سہارا لے کر انہیں جو ان کی عالمگیر قومی وحدت کا جزو لاینفک ہے اور جو انہیں ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کی ضمانت ثابت ہوگا۔

اور اس مرحلہ پر انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس اور اس کے نیشنلزم کے فریب سے خبردار کرتے ہوئے یہ اعلان کیا۔

> مسلمانوں کے خلاف اغیار کے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے طنزیہ نعرے سن کر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کا بدترین رجعت پسند اور شریر ترین فرقہ پرست جب کانگرس کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کو گالیاں دیتا ہے تو وہی سب سے بڑا "نیشنلسٹ" قرار پاجاتا ہے۔

(مسئلۂ دستورِ ہند۔ از نوابزادہ لیاقت علی خاں)

کانگرس اور اسکے عزائم کی نقاب کشائی

بھولے بھالے مسلمانوں کو تحریکِ پاکستان کے خلاف مبتلائے فریب کرنے کے لئے ایک منظم کوشش کے تحت پروپیگنڈہ کیا گیا (اور اب بھی یہ مہم جاری ہے) کہ ہندو مسلم کشمکش کی وجہ نزاع یہ تھی کہ کانگرس سارے ملک میں ایک مخلوط حکومت کی حامی تھی اور مسلم لیگ ''فرقہ پرست'' انگریز کے اشارے پر ''ملک کی تقسیم کی مدعی تھی''۔ یہ غلط فہمی آج بھی ان حلقوں میں بدستور پائی جاتی ہے جو کانگرس کے منظم پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے اور بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن جب واقعات وحقائق کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو اصل معاملہ اس سے کہیں گہرا نظر آئے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اہم دستاویز ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اس وقت کے جنرل سکریٹری (اچاریہ کرپلانی) کا وہ طویل بیان ہے جس کے ذریعے انہوں نے اگست ۱۹۴۳ء میں "کانگرس کے مقاصد" کی نشاندہی کی تھی۔ اس بیان کا حسب ذیل اقتباس کانگرس کے عزائم کی بولتی تصویر ہے۔ سنئے اور غور فرمائیے!

> وہ لوگ جو کانگرس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں لیکن اس سیاسی عقیدہ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگرس کے پروگرام کی بنیاد رکھی وہ درحقیقت نہ تو کانگرس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے "فلسفہ حیات" (آیڈیالوجی) نے کانگرس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب کانگرس صرف ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو بدیشی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بالکل بدل دینا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک قطعی طور پر نئے

فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے۔ جب تک کانگرس پر گاندھی جی کا اثر غالب نہیں ہوا تھا اس وقت تک کانگرس کے لیڈروں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہ راست کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ اس لئے ان لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگرس کا یہ کام نہیں کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریے رکھنے والے لوگ سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک سیاسی زندگی۔ دوسری معاشرتی زندگی۔ لیکن گاندھی جی نے آکر یہ اصول توڑ دیا۔ انھوں نے پرانے ڈاکٹرون کی تشخیص کو غلط قرار دے کر بتایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم اپنی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے الگ کر سکیں۔ اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے کانگرس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دے دیں بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو۔ اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگرس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔

(طلوع اسلام ستمبر ۱۹۳۸ء)

گاندھی جی حقیقی روپ میں

اس اقتباس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کانگرس کا نصب العین سیاسی آزادی کے حصول تک محدود نہ تھا بلکہ اب وہ اس مقصد و منتہیٰ کے لئے سرگرم کار تھی کہ اس برصغیر کی پوری آبادی پر گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کو ملک گیر نظام کی حیثیت سے مسلط کیا جائے۔ سوال پیدا ہوگا کہ گاندھی جی آخر کس فلسفۂ حیات کے معتقد اور داعی تھے۔ سو وہ بھی گاندھی جی کی اپنی زبانی سن لیجئے۔ انھوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا..... میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔
>
> (ینگ انڈیا - ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

معرکۂ دین و وطن

یہ تھا وہ فلسفۂ حیات جو کانگرس کی جدوجہد کا اصل منشا رتھا۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ اس کے جواب میں مسلم لیگ اور قائداعظم کیا چاہتے تھے اور ان کے پیش نظر نصب العین کیا تھا۔ قائداعظمؒ کے خطبہ صدارت رسالانہ اجلاس مدراس ۱۹۴۱ء) کا وہ اعلان سنئے جس میں انھوں نے فرمایا کہ

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انھیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائیگی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر رہیں گے۔

آئیڈیالوجی کی اساس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیتوں کا فرق اس قدر واضح تھا کہ وطن کے اشتراک پر ان کے ایک قوم کی صورت میں مدغم ہونے کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے صاف اور واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا۔

> ہندو اور مسلمان خواہ ایک گاؤں یا ایک شہر میں ہی کیوں نہ رہتے ہوں وہ کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ سے الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں۔

کراچی کے مسلم لیگ سیشن میں انھوں نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی کہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ

> وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی عمارت ملی کی بنیاد ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے

اور پھر خود ہی اس کے جواب میں اس عظیم حقیقت کا اعلان کرتے ہیں۔

> ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان یہ آہنی لنگر خدا کی وہ کتاب عظیم (قرآن) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسد واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک۔ خدا کی کتاب ایک اس کا رسول ایک۔ اس لئے ہماری ملت بھی ایک ہے۔
> (Speeches And writengs of Mr JINNAH P-80)
> VOL. II

بیورلی نکلس نے اپنی مشہور آفاق کتاب (VERDICT ON INDIA) میں ایک بطل عظیم سے مکالمہ کے عنوان سے متعلقہ باب میں قائداعظمؒ سے اپنی (۱۹۴۳ء کی) ایک ملاقات کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس ملاقات کے دوران میں دیگر اہم سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ

> آپ کن وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک مذہب ہی عبارت

مسلمان، ایک الگ قوم ہیں؟

اور پھر اسی شہرۂ آفاق صحافی اور انشا پردازی کی زبانی قائد اعظم کا جواب سنئے — جواباً انھوں نے فرمایا۔

یاد رکھئے کہ اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں بلکہ ایک عملی نظام حیات ہے۔ میں زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں اور پورے نظام حیات (مکمل دین) کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم سمجھتا ہوں۔ زندگی کے ہر اہم شعبے اور ہر عنصر کے لحاظ سے، ہماری تاریخ کے لحاظ سے، ہمارے مشاہیر اور اکابر کے اعتبار سے، ہمارے آرٹ اور فن تعمیر کے لحاظ سے، ہمارے قوانین اور اصول قانون کے اعتبار سے، الغرض ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز اور علیحدہ قوم ہیں — (کسی قدر توقف کے بعد) — ان تمام امور میں ہمارا زاویۂ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے بلکہ اکثر شعبوں میں کلیۃً متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ زندگی میں ہمیں ان سے مربوط کرنے والی کوئی چیز بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس، یہ سب ان سے مختلف ہیں۔ ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، ہمارے جنسی روابط، حیوانات کے ساتھ ہمارا طرز عمل، ہر نقطۂ نگاہ پر ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ (روبروکٹ آف انڈیا)

تحریک پاکستان کا یہی وہ اساسی تصور تھا جس کے خلاف گاندھی جی نے بڑے غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا تھا کہ

میری روح اس تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریات حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کرنا میرے نزدیک خدا سے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرا دلی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے (ہندوستان ٹائمز ۱۴)

گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھے اور یہ لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندومت اور تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴)

لیکن غیظ و غضب کا یہ طوفان قائد اعظم کو مرعوب نہ کر سکا۔ وہ ان اثرات سے بہت بلند واقع ہوئے تھے۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے

جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

قوم مذہب سے ہے

چنانچہ انھوں نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو گاندھی جی کے نام ایک خط لکھا۔ یہ خط سیاسیات کی

تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس قابل ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اس خط میں گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؛ اور وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جو آپ کو کسی مقصد کے لئے آمادہ عمل کرتا ہے۔ کیا وہ سیاست ہے؛ معاشرت ہے؛ یا مذہب؛ تو آپ کا جواب ہوتا تھا کہ وہ مذہب اور خالص مذہب ہے۔ کل تک تو آپ یہ کہتے تھے اور آج مجھ سے یہ فرما رہے ہیں کہ تم مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ سن لیجئے کہ میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ جو مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی معیار عطا کرتا ہے۔ مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔ (تقاریر و تحریرات جناح)

پاکستان۔ اسلامی آئیڈیالوجی کا مظہر

صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۴۱ء کے نام ایک پیغام میں قائداعظم نے تحریک پاکستان کے مقاصد کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ صرف جان توڑ مسلسل اور ناقابلِ شکست مساعی کے زور پر ممکن ہوگا کہ ہم اپنے عوام میں ایسی قوت پیدا کر دیں جس سے نہ صرف آزادی و استقلال کا حصول ممکن ہو بلکہ اسے نمایاں شان طور پر مستحکم بھی کیا جا سکے۔ پاکستان کا منتہاء مقصود آزادی اور استقلال تک محدود نہیں یہ اس اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہے جو ہمیں ایک بیش بہا ورثے اور سرمایہ حیات کے طور پر حاصل ہوئی ہے۔ اور جس کے ثمرات سے دیگر اقوام بھی مستفید ہوں گی۔

(Speeches And Writings By Mr. Jinnah, Vol. II P. 257)

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو گورنمنٹ کالج کے طلباء کے ایڈریس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

ہم (ہندو اور مسلمان) دو عظیم اقوام ہیں جن کا اختلاف مذہب ہی کا اختلاف نہیں بلکہ ہم دو مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں۔ ہمارا دین ہر شعبۂ حیات میں ایک ضابطۂ قانون عطا کرتا ہے اور ہم ان نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندو لیڈرشپ ہم پر رام راج مسلط کرنے کا عزم رکھتی ہے اور مسلمانوں سے ایک اقلیت کا سا سلوک کر رہی ہے۔ (ایضاً)

سرحد مسلم لیگ کی صوبائی کانفرنس پشاور منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۴۵ء میں ان کا خطاب بھی اسی نصب العین کا اعلان کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان ہے جہاں وہ اپنے مخصوص ضابطۂ حیات کے مطابق اپنی ثقافت و روایات کا نشو و ارتقاء اور اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لا سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۳۶)

۱؎ مذہب سے قائداعظم کا مفہوم آئندہ صفحات میں ان کے اپنے الفاظ سے واضح ہوگا۔

قائد اعظم کے یہ اعلانات پوری ملت کی اجتماعی امنگوں کے ترجمان تھے۔ یہ نو کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی آواز تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں اپنی ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کی تقریر میں کہا تھا۔

اسلام کے عہد ماضی کا احیاء مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین عطا کیا اور انہیں مایوسیوں اور تاریکیوں سے نکال کر ایک درخشندہ منزل مقصود تک لے آئی۔ وہ منزل جو ملت کا جزوِ ایمان قرار پا گئی اور لاکھوں افراد اس کے لئے جانیں لڑانے پر تل گئے۔ اب پاکستان ایک نعرہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اسے اپنی سلامتی، نجات، اور تقدیر ملی کا وہ مرکز و محور تصور کرتے ہیں جو دنیا کو بانگ دہل بتا دے گا کہ ایک ایسی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آگئی ہے جو اسلام کے عہد رفتہ کے کارناموں کی یاد ایک بار پھر تازہ کر دے گی (ایضاً)

بمبئی کے اسلامیہ کالج میں یکم فروری ۱۹۴۳ء کو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ:۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اور اسی بنا پر ہم اپنی جداگانہ مملکت کا قیام عمل میں لائیں گے۔

(Speeches And Writings By Mr. Jinnah Vol. I)

یہی واضح اور دو ٹوک اعلانات تھے جنہوں نے "رام راج" اور اکھنڈ ہندوستان کے جاہلانہ منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ گاندھی جی اور ان کے رفقائے سفر پورے برصغیر پر اپنا تسلط جمانے کے جو سہانے خواب دیکھ رہے تھے وہ خواب پریشاں بنتے چلے گئے۔ پاکستان کا مقصود و منتہا پوری طرح نکھر کر ان کے سامنے آچکا تھا۔ گاندھی جی دوسروں کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے کبھی کبھی یہ بھی کہتے رہے کہ میں پاکستان کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے قائد اعظم سے اپنے سلسلۂ مراسلت میں بھی یہی مضحکہ خیز انداز اختیار کیا کہ انہیں پاکستان کا مفہوم سمجھا دیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی تو ایک طرف ان کے شاگردوں تک یہ سب کچھ سمجھ چکے تھے کیونکہ قائد اعظم نے اس ملی نصب العین کو اس قدر صاف اور واشگاف الفاظ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ اس کے بعد اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں کانگرسی رہنما مسٹر منشی کی وہ صدارتی تقریر ہمارے سامنے آتی ہے جو انھوں نے یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ کی "اکھنڈ ہندوستان کانفرنس" میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس خطبۂ صدارت میں انھوں نے ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے سامنے تحریک پاکستان کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

پاکستان ہندو کانگرس کی نگاہ میں تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا ؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے

کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے اماکن و مساکن (HOMELANDS) بنا لیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون ۴۳ء)

اس کے بعد انھوں نے "اکھنڈ ہندوستان" کی وضاحت فرماتے ہوئے بتایا کہ

تم جانتے ہو کہ "اکھنڈ ہندوستان" کے سامنے کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد وہ عظیم الشان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے وہ کلچر جو زمانہ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا اور چھ ہزار سال کی مدت مدید میں بڑھتا، پھولتا پھلتا، زمانہ کی سطح کو روندتا اور مسلتا یوں آگے بڑھتا گیا جس طرح گنگا ماتا طوفان کے وقت امنڈی چلی جا رہی ہو۔ (ایضاً)

ان تصریحات کے بعد انھوں نے قوم پرست مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اہم سوال کیا تھا کہ:-

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قوم پرست مسلمانوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انہیں (پاکستان کے) اس "نظریۂ افتراق" کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ (ایضاً)

اور زمانے کی نگاہوں نے تاریخ اسلام کا یہ جگر پاش منظر اس مرحلے پر دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک مقتدر مذہبی پیشوا (بقول مسٹر منشی) بے تابانہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ گھبرائیے نہیں۔ پاکستان کی مخالفت ہم کریں گے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۴۸ء)

یہ مقتدر مذہبی پیشوا، کون تھے؟ یہ تھے لدھیانہ کے ایک مشہور مفتی اور جمعیت العلماء و کانگرس کے رکن رکین۔ اقبالؒ نے شاید اسی صورتِ حال پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا کہ

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آں جا پرستد مومن و کافر تراشد

واضح رہے کہ کانگرسی رہناؤں میں مسٹر منشی ہی واحد شہسوار نہیں جو تحریک پاکستان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترے بلکہ پورا ہندو ذہن منظم طور پر حرکت میں آچکا تھا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے قائد اور کانگرس کے انتہائی اعتدال پسند اور وضعدار قسم کے لیڈر تھے لیکن تماشا دیکھئے کہ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی اس جدوجہد کے خلاف وہ ان سے بھی بہت قبل مخالفت کے میدان میں آچکے تھے ان کے نومبر ۱۹۳۹ء کے ان الفاظ کو بھی سن لیجئے۔

بھولا بھائی ڈیسائی کا اعلان

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو اب وہ وقت آ چکا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانوں کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۵)

مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے بعد مسٹر ستیہ مورتی سامنے آتے ہیں۔ کانگریس کے مشہور پارلیمنٹیرین اور مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر۔ ۱۹۴۱ء میں جبکہ جنگِ عالمگیر کے دوران میں مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت قائم کرنے کی تجویز سامنے آئی تو انہیں ستیہ مورتی صاحب نے اعلان کیا کہ

کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کیونکر مخلوط حکومت بنا سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۱)

معرکۂ دین و وطن

کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں کا یہ پروپیگنڈہ برابر جاری رہا کہ قوم کا وجود وطن کے اشتراک پر قائم ہوتا ہے اس لئے اس برصغیر میں بسنے والے ایک وطن کی بنا پر ایک قوم ہیں وہ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے اس دعوے کے خلاف آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے کہ آئیڈیالوجی کی اساس پر بھی قوم کا وجود قائم ہوتا ہے۔ انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا گیا تو اکھنڈ ہندوستان اور رام راج کے قیام کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل ان کی ہمالیائی امنگوں کو ہمیشہ کے لئے گہری قبر میں دفن کر دے گی۔ یہ تھی وہ جنگ جو ملک کی دو بڑی قوموں میں جاری تھی۔ یہ تھا وہ معرکۂ دین و وطن جس کے انجام سے ان قوموں کی زندگی اور موت کا سوال وابستہ تھا۔ قائدِ اعظم کا اپنے اس عظیم دعوے میں ادنیٰ سی لچک قبول کر لینا یا مسلمانوں کا اس محاذ سے پسپائی اختیار کر لینا یقیناً رام راج کی صبح کا حرفِ آغاز ہوتا اور دس کروڑ مسلمان اپنے ملی تشخص اور عدیم المثال روایات کے رشتہ سے ہمیشہ کے لئے اس برصغیر میں اپنی موت کے عہد نامہ پر دستخط کر دیتے۔ سب سے بڑی قیامت یہ تھی کہ قوم و وطن اور جمہوریت کے وہ تصورات جو قریب قریب ساری دنیا میں رائج ہو چکے تھے کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دنیا کے ہر حصے میں مغرب کے انہی تصورات کی کارفرمائی تھی۔ اس لئے ملت کی نشاۃِ ثانیہ کی یہ جنگ ایک چومکھی

جنگ تھی۔ قائد اعظم بیک وقت دو محاذوں پر اپنی ملت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ انھیں ہندوؤں کی منظم چیخ و پکار سے بھی نبٹنا پڑا اور ان مروجہ مغربی تصورات سے بھی جو برطانوی حکمرانوں کی کتاب سیاست کا مقدس باب قرار پا چکے تھے۔ لیکن تاریخ کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ اس زعیم ملت نے ہر محاذ پر ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے دلائل و براہین کی شمشیر جوہر دار نے ہر دو محاذوں پر دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی سی مچا دی اور بالآخر سب کو شکست فاش دے کر اپنی فتح عظیم کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ دشمنوں کے طوفان باد و باد اور مخالفتوں کے اس ہجوم میں اس کے لرزہ خیز نعروں نے دلوں میں زلزلے ڈال دیئے۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب مسلم فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے عزم و یقین کی پوری قوت سے یہ اعلان کیا کہ

> پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ پاکستان کا تخیل ایک ایک مسلمان کے دل و دماغ پر چھا چکا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پاکستان، ہندوستان کی اسلامی مملکت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے…… اس برصغیر میں پاکستان کے سوا کوئی دوسرا دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔　　(خطبہ صدارت پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء)

اسی خطبۂ صدارت میں انھوں نے فرمایا کہ

> یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم ایک اقلیت نہیں۔ ہم ایک قوم ہیں۔ اور ایک قوم کو ایک خطۂ ارض کی ضرورت ہوتی ہے۔ قومیں ہوا میں زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ ایک قوم کو خطۂ ارض پر زندہ رہنا ہے اسے اس سرزمین پر اپنا نظام مملکت قائم کرنا ہے اور اس کی سرحدات کا تعین کرنا ہے۔ یہ ہے وہ مطالبہ جس کا حصول ہمارا منتہائے مقصود ہے۔　　(ایضاً)

اس خطبۂ صدارت کے اختتام پر انھوں نے فرمایا۔

> یاد رکھئے کہ جس مقصد عظیم کے لئے ہم برسر پیکار ہیں وہ محض مادی مفاد پر مبنی نہیں بلکہ یہ ملت اسلامیہ کی روح کی پکار ہے یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اسے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیتا ہوں۔ اور اسے سودے بازی کہنا سراسر غلط ہے۔ مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر ہم نے یہ بازی ہار دی تو ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔　(ایضاً)

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک طرز انہ میں خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ

> قیام پاکستان کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب ہندوستان کا پہلا ہندو اسلام میں آیا۔ اس سے بہت قبل جب یہاں مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ جونہی ایک ہندو اسلام کی آغوش میں آیا وہ نہ صرف مذہبی حفاظت بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی طور پر اپنی سوسائٹی سے خارج کر دیا گیا۔ یہاں تک

ایک مسلمان کا تعلق ہے اس پر تو اسلام کی طرف سے یہ فریضہ عائد ہے کہ وہ اپنے ملی امتیاز اور تشخص کو کسی غیر اسلامی معاشرہ میں جذب نہ ہونے دے۔ چنانچہ ہر دور میں ہندو بدستور ہندو چلے آئے اور مسلمان مسلمان رہے اور انھوں نے کبھی اپنی اپنی خصوصیات کو ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہونے دیا۔

یہ ہے پاکستان کی اصل و اساس۔

(Speech And Writings By Mr. Jinnah
VOL. II P. 64)

قرارداد پاکستان واحد حل ہے

اس صدارتی تقریر سے ایک سال قبل قائد اعظم نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کی صدارت فرمائی تھی۔ یہی وہ عظیم قومی اجتماع تھا جس میں قرارداد پاکستان کی صورت میں پہلی بار دس کروڑ مسلمانوں نے اپنی منزل مقصود کا تعین کیا۔ اس لحاظ سے اس اجلاس کی روئیداد ہماری سیاسیات میں ایک بے مثال تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس اجلاس میں قائد اعظم نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ تحریک پاکستان کے نصب العین کی روشن تفسیر ہے۔ تحریک پاکستان کی بنیادی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہم اس کا ایک اہم اقتباس پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہندوستان میں، ایک قوم، کا غلط تصور حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور ہماری بہت سی مشکلات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم نے بروقت اپنے رجحانات کی اصلاح نہ کی تو نتیجہ پورے ہندوستان کی تباہی ہوگا۔ یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان مذہب کے معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں کا ادب جدا جدا ہے نہ تو یہ آپس میں شادیاں رچا سکتے ہیں اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتے ہیں۔ حقیقتاً وہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ ان کی تاریخیں مختلف۔ ان کا رزمیہ جدا جدا اور مشاہیر الگ الگ۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ان کی فتح و شکست کی حیثیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر ڈالے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔ (قائد اعظم محمد علی جناح)

مہاتما جی کی خود فریبی

قائدِ اعظم کے ان تمام اعلانات اور خطبات کو سامنے لائیے۔ ایک ایک لفظ محسوس و مشہود حقائق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ایک ایک دلیل جیتے جاگتے واقعات اور روشن شواہد کی منہ بولتی تصویر ہے کہیں ابہام و اشکال نہیں، کہیں الفاظ کا الجھاؤ نہیں۔ نکھرے ہوئے مقاصد، صاف و شفاف آئینے میں جھلک رہے ہیں۔ لیکن برا ہو مہاسبھائی ذہن کی کرشمہ سازیوں کا کہ اس کے باوجود درخشندہ حقائق کو سیاسی عیاری سے غبار آلود کرنے کا رجحان برابر قائم رہا۔ اس رجحان کا اندازہ اس سلسلۂ مراسلت سے لگائیے جو بمبئی کی تاریخی گاندھی جناح ملاقات کے دوران میں وضاحت طلب امور کے متعلق دونوں عظیم رہنماؤں میں جاری رہی۔ اسی مراسلت میں سے قائدِ اعظم کے نام گاندھی جی کا ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کا ایک مکتوب ہمارے سامنے ہے۔ اس خط میں گاندھی جی مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> تاریخ میں مجھے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والی کسی جماعت یا اس کی اولاد نے اصل فرقے سے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ اگر ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پہلے ایک قوم بستی تھی تو ملک کے بہت سے باشندوں کے مذہب تبدیل کرنے کے باوجود اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے۔
>
> ...... اگر سارا ہندوستان اسلام قبول کر لے تو کیا دو قومیں ایک ہو جائیں گی؟ (ایضاً)

غور فرمائیے اس مضحکہ خیز دلیل پر اور پھر سوچئے کہ یہ ریت کے بند حقائق کے سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نہ جاتے تو اور کیا ہوتا۔ کیا دنیا کا کوئی معقولیت پسند انسان قائدِ اعظم کے لاجواب دلائل و براہین کے مقابلے میں خود فریبی کی ان ستم ظریفیوں کو کوئی اہمیت دے سکتا تھا۔ قائدِ اعظم نے ان لیڈروں کو چیلنج کرتے ہوئے کس قدر درست کہا تھا کہ

> آؤ اور اپنی نامعقول چیخ و پکار کا مقابلہ کرو اس حقیقت سے کہ اختلافِ مذہب کس طرح مطالبۂ پاکستان کی وجہ جواز قرار پاتا ہے۔

اور اس چیلنج سے قبل انہوں نے وہ حقیقت دیں الفاظ پیش کی تھی کہ

> پاکستان تو یہاں صدیوں سے موجود ہے۔ ہاں وہ اسی دن معرضِ وجود میں آ گیا تھا جب یہاں کا پہلا ہندو اسلام کی آغوش میں آیا۔ پھر وہ فوج در فوج اسلام میں آئے اور ہندو مذہب اور اس کے فلسفے نے انہیں ملیچھ اور اچھوت قرار دے دیا۔ ان سے اپنی مذہبی، معاشرتی، ثقافتی اور دیگر ہر قسم کے تعلقات ختم کر دیئے اس کے بعد وہ ایک الگ سوسائٹی کے افراد قرار پا گئے اور بدستور اسی ملت سے وابستہ چلے آ رہے ہیں ہزار سال سے زیادہ مدت گذر گئی وہ آج تک ایک الگ سوسائٹی، ایک جداگانہ فلسفۂ حیات، جداگانہ مذہب اور سراسر مختلف دنیا سے مربوط ہیں۔ (خطبۂ صدارت۔ سالانہ اجلاس پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، یکم مارچ ۱۹۴۱ء)

پاکستان اور اسلامی حکومت کا اساسی تصور

تحریک پاکستان سے متعلق کانگرس اور مسلم لیگ کی آویزش کی جو تفاصیل ہم نے ان صفحات میں پیش کی ہیں وہ ان مدلل دلائل اور روشن حقائق پر مبنی ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز قوم قرار دیتے ہیں اور اس سے مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ اپنی وجہ جواز اختیار کرتا ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مملکت پاکستان میں کس قسم کا نظام تحریک پاکستان کے قائدین کے پیش نظر تھا؛ یہ ہے وہ سوال جس کی اہمیت سالہا سال کے بعد بھی پاکستان میں بجنسہٖ محسوس کی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقت اور حالات کے تقاضوں نے آج اس کی اہمیت کو پہلے سے بھی کہیں بڑھا دیا ہے اور ہم بجا طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر اس سوال کا جواب قائد اعظم کی تقاریر اور بیانات سے منظر عام پر لایا جا سکے تو اس سے بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ ذہنوں سے بہت سا گرد و غبار دھل جائیگا اور پاکستان کے مستقبل کی تعمیر کا وہ نقشہ نکھر کر سامنے آ جائے گا جو تحریک پاکستان کے داعیٔ اعظم کا منتہائے مقصود تھا اور جس کو عملاً متشکل کرنے کے ولولوں میں پوری ملت ایک بنیانٌ مرصوص بن کر مخالفت کے پہاڑوں سے ٹکر لینے پر تل گئی تھی۔

اگرچہ جو کچھ ہم نے اس وقت تک پیش کیا ہے اس میں بھی پاکستان کی اسلامی مملکت کے متعلق واضح اشارے موجود ہیں۔ ہمارے سامنے اسلامی آئیڈیالوجی کو عملاً متشکل کرنے کا اعلان آ چکا ہے۔ اسلام کے عہد رفتہ کے کارناموں کی بازآفرینی اور اس کے اصول و قوانین کی نشاۃ ثانیہ کی حسین امنگیں واضح ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود مسئلہ کی نزاکت اس سے کہیں بڑھ کر ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس معاملہ میں قائد اعظم کے دو ٹوک اور قطعی اعلانات منظر اشاعت پر لائے جائیں جو مطالبۂ پاکستان اور اس کے طرز حکومت کے بارے میں "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہوں

آیئے! اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے قائد اعظم کے اس اہم انٹرویو کو روشنی میں لائیں جو ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد دکن میں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے لیا اور جس کی تفصیل اورینٹ پریس کے ذریعے اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہم سوالات اور ان کے جوابات کو بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔ غور سے سنیئے!

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوٰے ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے

متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک۔ در اصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائد اعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پہ ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر سٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پہ پھر غور کیجئے کہ

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(۳) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

سوچئے کہ کیا اسلامی حکومت کے اصول و مبادی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کہی اور سمجھی جا سکتی ہے۔

سرِ خدا کہ عابد و زاہد بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید

قرآنی نظام کی دعوت

اپنے دور کے ایک شہرۂ آفاق قانون دان کی حیثیت سے قائدِ اعظم فلسفۂ قانون اور اس کے اسرار و غوامض پر پورا عبور رکھتے تھے۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ ایک دستورِ مملکت کس طرح اساسی قوانین کی بنا پر نشوونما حاصل کرتا ایک کامیاب نظام کی صورت میں برگ و بار لاتا ہے۔ اسی فکر و بصیرت کی روشنی میں انہوں نے دینِ خداوندی کی مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کی اہمیت کو سمجھا اور اس یقینِ محکم کو اپنا خضرِ راہ بنایا کہ خدا کی آخری کتاب اسلامی مملکت کے اساسی قوانین کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ وہ کاروانِ ملت کو برابر یہ دعوت دیتے چلے گئے کہ اپنے نظامِ حیات کے ایوان کو قرآن کے انہی غیر متبدل اصولوں پر قائم کرو۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں اپنے پیغامِ عید میں انہوں نے فرمایا۔

> اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے۔ جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔
>
> اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے، مذہبؔ۔ معاشرت۔ تجارت۔ عدالت۔ فوج۔ سول۔ اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا۔ اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

(Speeches And Writing of Mr. Jinnah Volume I P. 465)

ؔ مذہب کے بارے میں قائدِ اعظم کا مفہوم سابقہ انٹرویو میں سامنے آ چکا ہے۔

ایک عظیم انتباہ

یہ تھا قرآنی نظام کا وہ نقشہ جو پاکستان کی اسلامی سلطنت کے متعلق قائد اعظم کے ذہن میں تھا۔ یہی نقشہ تھا جس میں کانگریسی لیڈر شپ کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا عکس نظر آرہا تھا اور وہ اس مطالبہ کو ناکام بنانے کے لئے اپنے بے شمار اور منظم ذرائع و وسائل بروئے کار لارہے تھے۔ اسی کے پیش نظر قائد اعظم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کے یوم پاکستان کی تقریب پر ملت کے نام اپنے پیغام میں اسے یوں خبردار کیا تھا۔

> ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہم ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس برصغیر سے مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔
>
> (ایضاً صفحہ ۳۰۵)

مطالبہ پاکستان کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے پیش نظر وفاقی نظام کے نفاذ کی کوششوں پر قائد اعظم نے برطانوی حکومت کو شدید انتباہ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ

> غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں یہاں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہو گا ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اس کو مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لیے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا اور اس ظالمانہ اقدام سے اس برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خط تنسیخ کھنچ جائے گا۔
>
> (علی گڑھ سٹوڈنٹس یونین میں ۲ نومبر ۱۹۴۱ء کو تقریر)

یہ ہیں تحریک پاکستان کے قائد کے وہ اعلانات جو اس جنگ کے دوران میں مختلف مواقع پر دنیا کے سامنے آتے رہے۔ اور ان کی بدولت تحریک پاکستان کا منتہا و مقصود پوری طرح نکھر کر سب کے سامنے آگیا۔ اس پوری جنگ کے دوران میں قدم قدم پر تحریک پاکستان کے مقاصد کا اسلام سے اس قدر گہرا رشتہ قائم رہا اور قائد اعظم نے اپنے دو ٹوک اعلانات کے ذریعے اس وثوق سے اس گہری وابستگی کی ضمانت پیش کی کہ ملت اسلامیہ نے پورے یقین و اعتماد سے اس منزل کو اپنایا اور اس راہ کے تمام خطرات کا عزم و ہمت سے مقابلہ کیا۔ ہماری قومی زندگی کی یہی وہ درخشندہ حقیقت ہے جو تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں برابر چراغ راہ اور نشان منزل کا کام دیتی چلی آرہی ہے۔ اور یہی تھی آفتاب عالمتاب کی وہ کرن جس کے خلاف شپرہ چشم عناصر کا شور و غوغا آسمانوں تک بلند ہوا۔ اسی آویزش کی داستان آئندہ اشاعتوں میں سامنے آئے گی۔

ضرورت رشتہ ایک نوجوان گریجویٹ، سرکاری ملازم کے لئے تعلیم یافتہ، بااخلاق سلیقہ شعار رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ خواہش مند اس پتہ پر لکھیں ۔ م ۔ ی ۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ لاہور

مصر کے عظیم مفکر اور حقیقت نگار

علّامہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین

کی مشہور تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

(اردو میں)

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اسکے محرکات و پس منظر پر محققانہ تبصرہ!

صفحات:- ۵۴۰ —————— قیمت:- چھ روپے

اِس پتہ سے منگوائیے:- ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی

علمی و تاریخی کاوشوں کا شاہکار

اور

اسلام کی سرگزشت کے سلسلۂ دراز کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اردو زبان کا لباس پہنایا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا

ضخامت ــــ نو سو صفحات قیمت ــــ آٹھ روپے

مکتبہ طلوع اسلام

۲۰-بی ــــ شاہ عالم مارکیٹ ــــ لاہور

قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا

نکھرا ہوا حل

جلد اوّل — جلد دوم — جلد سوم

مفسرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص دلکش شگفتہ اور آسان فہم اندازِ نگارش

سلیم کے نام خطوط

یہ حقیقت کشا خطوط قلبِ سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جان نواز تحریک ہیں۔

قیمت

جلد اوّل ——— آٹھ روپے

جلد دوم ——— چھ روپے

جلد سوم ——— چھ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۰-بی ——— شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

دُنیا کی نجات

پرویز

(طلوع اسلام کے ایک دیرینہ کرمفرما اور علم دوست قاری اپنے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:- "پرویز صاحب کا فکری ارتقا کسی ستائش کا محتاج نہیں۔ وہ اس راستہ میں دن بدن آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں ---- اور ایسا ہونا بھی چاہیئے ---- لیکن جو کچھ انہوں نے اپنے آغاز سفر ---- طلوع اسلام کے دہلی کے دور ---- میں لکھا تھا وہ بھی میرے نزدیک کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ جس طرح اقبالؒ کی مثنوی اسرار و رموز ان کی فکر کا سنگِ بنیاد ہے، وہی حیثیت پرویز صاحب کے دور اول کے مضامین کی ہے۔ اس میں قرآنی تعلیم کے اصول و مبادیات نہایت صاف، سادہ اور دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ ان مضامین کی عام اور بار بار اشاعت کی ضرورت ہے۔ طلوع اسلام کے دور اول کا فائل بہت کم احباب کے پاس ہوگا۔ کم از کم میرا فائل تو حوادث تقسیم کی نذر ہو گیا تھا۔ اس لئے اصل پرچوں کی طرف رجوع ناممکن ہے۔ ان میں سے کچھ مضامین "فردوسِ گم گشتہ" میں شائع ہوئے تھے لیکن اب وہ مجموعہ خود "فردوسِ گم گشتہ" ہو چکا ہے۔ درخواست ہے کہ آپ اس مجموعہ کی بار دیگر اشاعت کا جلد از جلد انتظام فرمائیں۔ اور اس اثنا میں، ان میں سے چیدہ چیدہ مضامین کو طلوع اسلام میں شائع کرتے رہیں۔ یہ بڑی مفید خدمت اور اکثر قارئین کی تسکین کا موجب ہوگی۔"

طلوع اسلام:- ہم اپنے رفیق محترم کے مشورہ کے شکرگزار ہیں۔ "سلیم کے نام خطوط" کی اشاعت سے فارغ ہو چکنے کے بعد ہمارے سامنے "فردوسِ گم گشتہ" کے تازہ ایڈیشن کا سوال ہے۔ لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا۔ اس دوران میں ہم وقتاً فوقتاً ان میں سے منتخب مضامین طلوع اسلام میں شائع کرتے رہیں گے۔ اس کی ابتداء اس مجموعہ کے سب سے پہلے مضمون "دنیا کی نجات" سے کی جاتی ہے جسے پرویز صاحب نے سنہ [illegible]ء میں تحریر فرمایا تھا۔]

جاڑے کی کپکپاتی رات ہے۔ کرزن روڈ (نئی دہلی) پر وسیع پائیں باغ کے اندر ایک مغربی قصر رنگین کے جدید شیشوں سے بجلی کے لیمپ کی شعاعیں حسن بے پرواہ کی بیتابی نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، فرنگی صوفوں اور

حریر و اطلس کے زرنگار پردوں سے دامانِ باغبان و کفِ گلفروش کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی۔ اور مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے۔ بلوری ساغروں کی کھنک اور آتشِ سیال کی دمک۔ یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے۔ آتشدان میں کوئلہ دہک رہا ہے جس کے شعلے ابھر ابھر کر اس جہانِ رنگ و تعطر کو جھانکتے ہیں۔ لیکن سرخیِ غازہ اور مے ارغوانیت کے سامنے مانند پرِ کاہ آتشِ حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب "انسان" ہیں۔ انہیں اس کا اختیار ہے کہ جب جی چاہے فطرت کے عطیۂ عظمیٰ، امتیازِ انسانیت، یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں۔ لیکن جمادو نباتات کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ پتھر کا کوئلہ اپنے فریضۂ منصبی کی سرانجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ اس فضا کی ہوشربا رنگینیوں سے متاثر نہیں۔ وہ اپنی گیس کو برابر فضا میں پھیلاتے جا رہا ہے۔ دروازے، کھڑکیاں، روشندان، سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ دم گھٹنے تک کی نوبت آ پہنچی۔ ان میں سے جو بالکل مدہوش و خود فراموش ہیں انہیں تو فطرت کی یہ تنذیر بھی نہیں چونکا سکی۔ لیکن جن میں ابھی کچھ ہوش باقی ہے۔ انہیں فضا کی ہیئت کا احساس ہوا۔ کوئی بیتابانہ دروازے کی طرف بھاگا کوئی کھڑکی کی جانب لپکا۔ اس وقت نہ ساقی کا خرام ناز ان کی راہ میں حائل ہوا، نہ نغمۂ مطرب کی دلکشی دامنگیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ پیالے کے لڑھکنے کا احساس۔ اس وقت تمام توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے اس کا بھی کسی کو خیال نہیں۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹخنیاں بھی نہیں کھلتیں۔ اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں۔ یہ کیا ہوا؟ وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے عیش و طرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی کرب و الم کا جہنم کیوں بن گئی؟ کیف و سرور کے وہ جاں نواز لمحے جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو کر رہ جائیں۔ تاکہ زمان و مکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کر سکیں، انہیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشان کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ خلافِ فطرت فضا کی کثیف ہوا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی، اور جان بچانے کے لئے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور شیشوں کو سر مار مار کر توڑنا پڑا۔ آئینِ فطرت کی خلاف ورزی کب تک کی جا سکتی تھی۔ بند کمرے میں کوئلہ سلگانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

انسان اور حیوان کی زندگی کا فرق

لیکن سائنس کا مسئلہ تو انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے متعلق ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ جس طرح کمرے میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھاگ کر جان بچائی وہاں ان کے ساتھ دو تین کتے بھی تھے، انہوں نے بھی ان ہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں۔ وہ بھی باہر نکلنے کے لئے ان ہی کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ بیقرار و بے تاب تھے۔ لیکن کیا انسان اور کتوں میں کوئی فرق نہیں؟ کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے۔ ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی کیف

دستی میں کسے تاکوئی حقہ نہ تھا، حالانکہ وہ بھی برابر کا شریک بزم تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس حصے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے شعبے سے ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک نہیں بلکہ انسان کے لئے مختص ہے۔ اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لامحالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا بُرا)، حیوانی زندگی سے ماوراء ہے اور جب یہ کیفیت دنیائے لذت وطرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق انسانیت سے ہے۔ جس طرح طبیعی زندگی کے لئے آئین وضوابط متعین ہیں اسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے دساتیر اور قوانین مقرر ہیں۔ پھر جس طرح طبیعی زندگی سے آئین وضوابط کی خلاف ورزی سے مضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے ضرر رساں نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلد اور بدیہی طور پر ہوتا ہے اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج و عواقب کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ یہ اثرات سر کی آنکھوں کی بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور یقینی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب ذرا گزن روڈ کے متذکرہ صدر کمرہ کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجئے۔ حتیٰ کہ یہ پھیلتے پھیلتے پورپ کے چاروں گوشے بن جائیں۔ جو کچھ اس کمرے کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تہذیب مغرب رکھ لیجئے۔ رنگ و چنگ کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں حیوانی زندگی کے مقتضیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اشیائے فطرت کو مسخر کیا، لیکن کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے پورے کرانے کا ذریعہ بن سکیں۔ وہ ساقی مغرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی۔ وہ اس طوفانِ کیف ومستی میں غرق تھے اور اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ گرد وپیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے لیکن جنہیں اللہ نے دیدۂ بینا عطا فرمایا تھا، ان کی نگاہیں کوئلے کی اس مسموم گیس پر تھیں جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی۔ جس طرح ایک طبیب حاذق سنکھیا کھانے والے کے انجام کے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے، اسی طرح ایک مردِ مومن جسے اللہ تعالیٰ قرآنی بصیرت عطا فرمائے، قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مآل کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے۔ اور اس طرح اس کے آئینۂ ادراک میں وہ حوادث اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں جو ابھی ضمیرِ فلک میں پہلو بدل رہے ہوں۔ اس لئے کہ جس طرح حیوانی زندگی سے متعلق فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں، اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق بھی اس کے دساتیر وضوابط ناقابلِ تغیر ہیں۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ لہٰذا جس طرح ایک طبیب حاذق خواص الاشیاء کے علم کی بنا پر اس کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں چیز کا طبعی نتیجہ کیا ہونا چاہیئے، اسی طرح ایک قرآنی مفکر اقوام وملل کے اعمال وحوادث کو قرآنی میزان میں رکھ کر پہچان لیتا ہے کہ اس کی فلاں روش انہیں کس منزل کی طرف لے جا رہی ہے۔ ایک ایسا ہی مردِ مومن تھا جس نے اپنی فراستِ[1] ایمانی سے آج

[1] ٹھیک ایسا حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے؛ اس کا نور اللہ کی کتاب ہے۔

سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ (اقبالؒ)

لیکن مادہ پرستی کے نشے میں سرشار مغرب میں ہوش کہاں تھا کہ وہ ان تنبیہات پر کان دھرتا۔ وہ اپنی روش میں مست رہا اور فضا کثیف سے کثیف تر ہوتی چلی گئی، تا آنکہ اس کی سمیّت اس حد تک بڑھ گئی کہ اس میں دم گھٹنے لگا اور آج حالت یہ ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان اطمینان کا سانس لے سکے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۲۵)

عذابِ خداوندی

اور اس فتنہ سے بچتے رہو جو اگر اٹھا تو اس کی زد صرف ان پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں (بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے) اور جان لو کہ اللہ کا قانون نتائج مرتب کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔

ان کے ساتھ دوسرے لوگ اس لئے زد میں آجاتے ہیں کہ ؎

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اس زہر آلود تمدن کا سر چشمہ اگر یورپ تھا تو باقی دنیا بھی اس کی پرورش میں برابر کی ممد و معاون تھی۔ اس لئے یورپ کی بھٹیوں سے اُبھرنے والی آگ کے شعلوں کی لپیٹ سے باقی دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی۔ عذاب آیا اور اس انداز سے کہ جو جو شکلیں ذہنِ انسانی میں متصور ہو سکتی تھیں سب آنکھوں کے سامنے آگئیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ (۶/۶۵)

کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیجے یا تمہارے پیروں تلے (نیچے سے) کوئی عذاب پیدا کر دے۔ یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو۔ اور ایک گروہ دوسرے (گروہ) کی شدت (قوت) کا مزہ چکھے۔

غور فرمائیے! ان میں سے کونسی شکل ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ آسمان سے عذاب، زمین سے عذاب، پانی میں عذاب۔ ایک قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار، ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا اور ایک دوسرے کی شدت قوت کا شکار۔ اور پھر ایسے ایسے مقامات سے عذاب جو اس سے پیشتر وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ابھی کل تک آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے دیگر جزائر محفوظ ترین مقامات خیال کئے جاتے تھے۔ آج یہ جگہیں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔

فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۳۹/۲۵)

اُن پر ایسے ایسے مقامات سے عذاب آیا جو ان کی عقل و شعور اور وہم و گمان میں بھی)

نہ تھا۔

اس دم گھٹنے والی فضا میں جن ارباب فکر کو کچھ ہوش باقی ہے ان کے دل میں فطرت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ وہ ادھر اُدھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتابانہ دوڑ رہے ہیں۔ ان ہی میں جریدہ اسٹیٹسمین کے مدیر مسٹر آرتھر مور بھی ہیں جو صاحب قلم میدانِ صحافت و سیاست میں بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سالِ گذشتہ متحارب ممالک کا دورہ کیا۔ اور ان اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں۔ انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا۔ اور اس کے بعد اپنے اخبار میں

"ہماری موجودہ جنگ"

کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا۔ جو گذشتہ ماہ سے التزاماً شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس مقالہ میں زندگی کے موجودہ

آرتھر مور کا تبصرہ

مسائل کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند یہ کوشش ایسی کامیاب نہیں جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی (اس لئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں، علم خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں۔ اور جب انسان کے پاس علم خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے کہ كلما اضاء لهم مشوا فيه و اذا اظلم عليهم قاموا (۲۰)۔ جب فضا اس کی چمک سے روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتے ہیں) بایں ہمہ مسٹر مور کی طلب و جستجو اور تپش و خلش سے اتنا ضرور مترشح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آچکا ہے اور نظامِ حیات کو آئینِ فطرت کے مطابق متشکل کرنے کے لئے کس درجہ بیتاب ہے۔ مسٹر مور مختلف سیاسی نظریات و رجحانات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں۔

> میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک عالمگیر جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ وہ جانکاہ مصیبت ہے جس کی تدبیر فوراً نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو اس کے بعد بھی سطح ارض کے ایک بڑے حصّہ پر اس آگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل میں۔ اس مصیبت کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں ان میں خود ایک مشترکہ اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے۔ (اسٹیٹسمین ۱۲ اپریل ۴۰ء)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

۱؎ وہ ممالک جو دوسری جنگِ عظیم میں الجھے ہوئے تھے۔

> ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظام جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکیین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل لئے ہوئے ہے۔ ان کے نظام جدید یا ارتقاء میں تصور ناگزیر ہے۔ لیکن کس قسم کا ارتقاء؟ ایک اندھی قوت کا ارتقاء۔ ان کے ہاں عقل کو بہت بلند درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تغلب اور اس کے لئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو ان کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصد زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے برعکس جمہوری ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقاء کا۔ وطن پرستی، فرض منصبی کا احساس، خوف، نفرت، یا محض مجبوری، ان کی قوتِ عمل کے محرکات ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارتقاء کی جدوجہد میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقائی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقاء کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔ (اسٹیٹسمین ۵، نومبر ۱۹۴۲ء)

یہ ہے مسٹر مور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا کیا حل تجویز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

مصیبت کا حل

> اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظام جدید کو متمکن کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک جدید مذہب کی تشکیل ایسی ہی ضروری ہے جیسی آلات و سامان حرب کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی۔ (ایضاً)

مذہب کے امتزاج سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی صداقتوں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جائے۔ جو حیوانی ارتقاء کے بجائے لاہوتی ارتقاء (DIVINE EVOLUTION) کا مؤید ہو۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ہم مذہبی ارتقاء کے عقیدہ کا جواب لاہوتی ارتقاء کے عقیدہ سے دیں گے۔ بشرطیکہ یہ عقیدہ انسانیت کے مذہب کی حیثیت اختیار کر لے۔ ظاہر ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ یعنی ان مختلف مذاہب مثلاً عیسائیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت، یہودیت، وغیرہ میں۔ (ایضاً)

دوست آپ مسٹر مور کی اس پریشانی فکر و نظر کا چنداں خیال نہ کیجئے جو ان کے تجویز کردہ علاج کے ایک ایک فقرے سے نمایاں ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ حیوانیت کی زندگی کو منتہائے نگاہ سمجھنے والے، خالص دہریت پسند، مذہب گزیدہ، یورپ سے یہ کس قسم کی آواز اٹھ رہی ہے۔ اس کے بعد مسٹر آرتھر مور لکھتے ہیں۔

> بنیادی مشکل اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ کیا انسان ایک مختار بالارادہ ہستی ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے۔

> دنیا کو آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس سوال پر ارتقاء کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں از سرِ نو غور کیا جائے۔

یہ غور و فکر کن خطوط پر ہونا چاہیئے، اس کے متعلق رقمطراز ہیں۔

اس وقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے ہر ایک غالباً اس صداقت کو تبرکاً بطور یادگار محفوظ رکھے ہوئے ہے جسے اس کے بانی نے سمجھا۔ لیکن یہ صداقتیں زمانہ قدیم کے مذہبی معتقدات اور فروعات میں کچھ اس طرح گھر چکی ہیں کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ دورِ حاضرہ کے انسان کے لئے ناقابلِ اطمینان صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ہر ایک ملک میں روشن خیال طبقہ مذہب کو چھوڑتے رہا ہے۔ اور اس طرح مذہب کی گرفت ہر جگہ ڈھیلی پڑ چکی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ نفسِ مذہب کو (نہ کہ اس مذہب اور اس مذہب کو) اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انسان کی بصیرت اسے تسلیم کرے۔ مذہب پر ارتقاء کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں از سرِ نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔ (ایضاً ص ۴۶)

اس کے بعد مسٹر موور لکھتے ہیں کہ جامد مذاہب نے (یعنی ایسے مذاہب نے جو انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے) لوگوں میں بے دینی اور تعطل پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے مذہب کو ارتقائی نظریہ کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اس صورت میں

نسلِ انسانی کی تدریجی تکمیل اور زمین پر خدا کی بادشاہت کا تصور ایک جوش انگیز امکانی شکل اختیار کرے گا (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے۔

عروج وارتقاء (EVOLUTION) میں خدا کا تصور جامد نظریہ تقدیر اور ہر قسم کے تعطل اور بے حسی کا نقیض ہو گا ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم کسی طرح یہ معلوم کر سکیں کہ خدا کی مرضی کیا ہے تو اس کا علم ہمارے اندر تحریک پیدا کرے گا اور اس طرح ہمارے مرضی خدا کی مرضی کا گویا عکس بن جائے گی اور ہم ایک جدید مفہوم میں ارتقاء کے اس لامتناہی تخلیقی ڈرامہ میں ایک بااختیار فعال ایکٹر کی حیثیت سے حصہ لے سکیں گے۔ (سٹیٹسمین ۱۰ نومبر ۱۹۶۷ء)

آج دنیا جس عدم اطمینان و فقدانِ سکون کے جہنم سے گذر رہی ہے اس کی علت بیان کرتے ہوئے مسٹر موور لکھتے ہیں۔

ایک ایسی دنیا جہاں مصنوعات نوعِ انسانی کی خدمت کی غرض سے نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے تیار کی جائیں کہ ان کی فروخت سے دوسروں کا روپیہ بٹورا جائے، دولت سب سے اہم مسئلہ بن جاتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ جمع کیا جائے۔ قوت اور حفاظت روپے کے اندر سمٹ کر آ جاتی ہے۔ دولت کی ملکیت کامیابی کا نشان اور عزت و وقار کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ کوئی پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی۔۔۔۔۔ اس کے لئے علاج یہی ہے کہ ہم کو یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظامِ معیشت ٹوٹ چکا ہے اور دوسرا کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بدلنا پڑے گا۔ (سٹیٹسمین ص ۴۸)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحبِ مضمون کی پریشانی فکر و نظر، ان کی بیتابی قلب کی غمازی ہو رہی ہے، دوسری طرف طلب و جستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ موجودہ فضا کی کثافت ہوا سے دم گھٹ رہا ہے اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جد و جہد ہو رہی ہے۔ مسٹر موور نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے، جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں) اس کا ماحصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ

ماحصل

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظامِ تمدن کے ثمرات ہیں۔

(۲) وہ نظامِ تمدن جس میں نہایت بیگانہ وحیوانی مقتضیاتِ زندگی سے آگے نہیں بڑھتا جہاں انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں کامیابی قوت اور عزت کا معیار دولت کا حصول ہو سکتا ہے۔

(۳) ہٹلر[1] اور مسولینی[2] فقط اس غیر فطری نظام کے مظاہر ہیں۔ اس لئے اگر انہیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) دنیا میں امن و سکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظامِ تمدن و عمرانیت کی بنا ڈالی جائے۔

(۵) وہ نظامِ جدید جس میں

(ا) انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو لامتناہی خیال کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کے لئے عروج اور بلندی کے کئی اور مراحل طے کرنے ہیں۔ یعنی ارتقائے انسانی کا نظریہ پیدا کیا جائے۔ اور

(ب) جس میں کامیابی۔ قوت اور عزت کا معیار دولت نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو۔

(۶) اس نظامِ جدید کو بطور عالمگیر مذہب انسانیت پیش کیا جائے۔

(۷) اس مذہب کی تشکیل کے لئے مختلف مذاہب کی صداقتوں کا امتزاج کیا جائے۔ کیونکہ مذہب کے اصلی حقائق ازمنۂ قدیم کی توہم پرستی اور فرعی مسائل کے پردوں میں چھپ چکے ہیں۔

(۸) مذہب کا مقصد جمود و تعطل نہ ہو بلکہ وہ انسان میں قوتِ عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہو جس سے انسان عروج و ارتقاء کے منازل طے کر سکے نیز یہ بصیرتِ انسانی کو اپیل کر سکے۔

(۹) انسانی جدوجہد کا ماحصل یہ ہو کہ وہ کسی طرح مشیتِ خداوندی (خدا کی مرضی) معلوم کر سکے۔ اور پھر اپنی مرضی کو اس طرح خدا کی مرضی کے تابع کر دے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔

(۱۰) اس طرح اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہو سکتا ہے۔

غور فرمائیے! عہدِ حاضر کے نظامِ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمۂ سکون و راحت کی تلاش ہے ہر چند وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک وہیں پہنچنا چاہتا ہے جہاں انسان کو قرآن پہنچانا چاہتا ہے۔ اسلام کے بنیادی خط و خال ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔

---

[1] جرمنی کی تحریک نازی ازم کا ڈکٹیٹر۔ [2] اٹلی کی تحریک فاشزم کا ڈکٹیٹر۔ یہ دونوں، دوسری جنگِ عظیم میں ختم ہو گئے تھے۔

اسلام کے بنیادی خط و خال

(۱) اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے جو ایک عبد مطلع کے نکرو نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یعنی کسی انسان کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ انھیں نسلوں یا قوموں میں تقسیم کر دینا، وحدتِ انسانیت کی جڑ کاٹ دینا ہے۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد ہار بچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔ آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری حدود و بندیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست و بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کرلے۔ ادھر دل و جگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ بلکہ حلق سے نیچے اترتے ہی جھپٹ لی جائے۔ جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسا نفسی پیدا ہو جائے، اس کا انجام معلوم!

(۲) پھر جیسا کہ ارتقاء سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا، اسلام کے نزدیک موجودہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس سے پہلے صرف حیوانیت کا ارتقاء تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوگا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ خداوندی کا کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جس قدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی جائے گی۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشوو ارتقاء، زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو خدائے رب العالمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کا ضابطۂ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطے کے قوانین بھی غیر متبدل اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ہیں، اور بلحاظِ زمان و مکان تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانے کے اقتضاءات کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ اور اس طرح یہ نظامِ زندگی ایک جامد اور ساکن مذہب کے بجائے، انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہ نمائی کرتا جائے گا۔ قرآن انسانی عقل و بصیرت کو اپیل کرتا ہے اور اس کے علم و شعور کی پرورش چاہتا ہے۔ اس لئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۴) اسلام چند افراد کا نہیں تمام نوعِ انسانی کا عروج و ارتقاء چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا نظامِ زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی حیثیت اجتماعیہ کا مرکز خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے جس جماعت میں یہ اقرار محسوس طور پر متشکل ہوتا ہے اس کا

نام ملتِ اسلامیہ ہے جس کی شیرازہ بندی ختمِ نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ ملت، ملتِ واحدہ ہوگی، مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبر کے نشو و ارتقاء کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظامِ زندگی کے اصول متعین ہو گئے۔ ان اصولوں کے ماتحت جزئیات کی تشکیل انسانی تفقہ و تدبر کی رو سے ہوگی۔

(۵) اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ میں کامیابی، قوت اور عزت کا معیار دولت نہیں بلکہ شرفِ انسانیت ہے۔ جس کی یہ شرف و استحکامِ خودی کا زیادہ ہوگی وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہے۔ دولت اور قوت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے گی، افراد یا کسی خاص گروہ کے استبداد و تغلب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں اکتناز کی بھی اجازت نہیں۔ نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے، نیچے کے طبقہ میں آئے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہیں۔

(۶) یہ ہیئتِ اجتماعیہ جس کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی، نظامِ انسانیت کو ضابطۂ خداوندی کے مطابق چلانے کی ذمہ دار ہوگی اور اس طرح خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو "خدا کی مرضی" اس کے قوانین کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع لے آئے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہوگا۔ مجبور اس لئے کہ اپنے آپ کو ایک آفاقی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا اور مختار اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو ضابطۂ خداوندی کے تابع اپنے فیصلے سے لائے گا نیز اس لئے کہ اس جبر سے جو اختیار پیدا ہوگا وہ اسے اس قابل بنا دے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کرے۔ استحکامِ خودی اور جوشِ کردار سے یہ اس مقامِ بلند پر جا پہنچے گا کہ خدا کے سوا کوئی اور قوت اس پر غالب نہ ہوگی۔

(۷) اس ہیئتِ اجتماعیہ میں ہر فرد اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھے گا۔ اس لئے معاملات کی دنیا میں جادۂ عدل و انصاف سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکے گا۔ یہ جواب دہی اس خدا کے سامنے ہوگی جو دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں سے واقف ہے۔ اس لئے خدا کے اس بندے کے اعمال و افعال حاضر و غائب یکساں ہوں گے۔ کیونکہ تمام افعال، قانونِ مکافاتِ عمل کے تابع رہیں گے۔ یہی جواب دہی سے مقصود ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کو اس کا حق ملتا چلا جائے گا اور کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

یہ ہے مختصراً وہ مذہب جس کی آج مسٹر آرنلڈ ٹوائن بی اور ساری دنیا کو تلاش ہے۔ لیکن مسٹر ٹوائن بی سمجھتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مذہب مختلف مذاہب کے امتزاج سے پیدا کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اسے اس قسم کا مذہب کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اس قسم کا مذہب (اسلام) موجود ہے تو پھر مسٹر ٹوائن بی کو نظر کیوں نہیں آتا؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسے اسلام نظر آئے کہاں سے؟ موجودہ

مسلمانوں کی زندگی میں تو اسلام نظر آ نہیں سکتا۔ باقی رہے اس کے ماخذ۔ سو وہ اندھی تقلید اور روایات کی چادروں میں اس طرح لپٹے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اب اسلام نام ہے چند رسومات کا جن سے مدت ہوئی روح نکل چکی ہے یا نام ہے باہمی سرپھٹول کا جس کا نتیجہ ہماری موجودہ زندگی ہے۔ جس سے ہم خود نالاں ہیں۔ کہیئے کہ یہ مذہب تسکین روح کے متلاشیوں کے لئے کس طرح جاذب نگاہ بن جائے؟ آج اسلام کے لئے دنیا بے قرار ہے لیکن یا للعجب! کہ تمام عالم اسلام میں خدا کا ایک بندہ ایسا نہیں جو اسلام کو اس کے صحیح خط و خال میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمانوں میں جو لوگ مغرب کے کرب والم اور اس کے اسباب و علل سے واقف ہیں وہ اسلام سے بیگانہ ہیں اور جو مذہب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں ان بیچاروں کو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں۔ اس لئے کہ ظہر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے)۔ اب جویان حقیقت تک اسلام کا پیغام کون پہنچائے؟ صدیوں کے بعد مبداء فیض کی کرم گستری سے ایک ایسا مرد دانا[1] پیدا ہوا تھا۔ جو ایمان و حکمت، ذکر و فکر، عشق و عقل یعنی شرق و مغرب کا مقام اتصال تھا۔ لیکن (اسے دنیا کی بدقسمتی کہیئے کہ) وہ ابھی مغرب کو اس کے نظام تمدن کے انجام و عواقب سے آگاہ ہی کر رہا تھا کہ وہ دنیا سے چل بسا۔ اس وقت چونکہ مغرب کے سامنے اس کے نظام کے اثرات محسوس طور پر بے نقاب نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اس مرد دانا کی باتوں کو "پرانے زمانے کے پند و نصائح" سمجھ کر ٹال دیا گیا۔ آج جب وہ آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور سارا یورپ (بلکہ تمام دنیا) اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے اگر وہ مفکر قرآنی زندہ ہوتا تو وہ اس پوزیشن میں تھا کہ مفکرین مغرب کو مخاطب کر کے اسلام کا پیغام دیتا۔ اور وہ اس کی سنتے بھی، اور سننے کے بعد اس پر غور بھی کرتے۔ اس نے آج سے بہت پہلے یورپ کے نام یہ پیغام بھیجا تھا۔

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل زکف انداختۂ — آہ ازاں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است — بال بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک — آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آنکہ زند سیر چمن مثل نسیم — آں کہ در شد بہ ضمیر گل و نسریں دگر است

---

[1] حکیم الامت علامہ اقبال رح۔

دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے | این سوئے پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است
اے خوش آن عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست | نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

اور اس کے بعد کہا ؎

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و سرِ تازہ کنیم (پیامِ مشرق)

یہی "آئینِ دگر" ہے جسے آج ساری دنیا (NEW ORDER) کے نام سے پکار پکار کر ڈھونڈھ رہی ہے۔ اس "آئینِ دگر" کی وجہ جواز یہ تھی کہ

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اُس وقت دنیا کی نگاہیں تہذیب نو کی تابندگی سے خیرہ ہو رہی تھیں اس لئے وہ "جہانِ دگر" کو کس طرح دیکھ سکتی تھی؟ یہ "جہانِ نو" وہ دیکھ سکتا تھا جس کی آنکھیں قرآنی فراست سے منور تھیں۔ اس نے اس جہان کو دیکھا اور برملا کہہ دیا ؎

من درین خاک کہن گوہرِ جاں می بینم | چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز | شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم | پرِ کاہے صفتِ کوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک | بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند | جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند (پیامِ مشرق)

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآن کریم عبد مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ تصور کہ اس مردِ حق شناس کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

لیکن آج یورپ کا پورا "مجذوبِ کدۂ فرنگ" مقامِ کبریا کی تلاش میں ہے لیکن وہ مردِ مومن موجود نہیں جو اسے بتا سکے کہ مقامِ کبریا کیا ہے۔

بایں ہمہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خدائے حیّ و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کا نصاب ہے اس لئے اس نورِ بصیرت کے عام ہونے کی تدبیر ہو کر رہے گی۔ ہمیں تو صرف اتنا افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سامنے سعادت و خوش بختی کا ایک ایسا نادر موقع آیا اور یہ اس سے یوں محروم رہ گئے۔ شایان کے جرائم کی پاداش ایسی ہلکی نہیں جو اتنی جلدی ختم ہو جائے۔

لیکن ہم لاکھ خطاکار سہی، کیا اس کے سحابِ کرم کی گہرباری سے آج بھی امید نہ رکھیں کہ اس دانہ کو جو ہنوز آغوشِ زمین میں پیوست ہے اپنی آنکھوں سے "شاخ در شاخ، برومند و جواں" دیکھ لیں۔ وہ گرد جو آج ساری دنیا کے مطلع کو گھیرے ہوئے ہے چھٹ جائے اور اس کے اندر سے وہ "سوارِ اشہب دوراں"[1] جسے دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھیں ترس گئی ہیں، باہمہ جبروت و ملکوت، ہمارے سامنے وجہِ شادابیٔ عالم ہو جائے۔ اور ایک بار پھر اس زمین[2] پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ جائے!

اے وہ کہ جس کی رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے، کیا تیری درگاہ سے یہ نمناک آنکھیں مایوس لوٹ آئیں گی؟
الٰہی تو تو ربّ العالمین ہے!

---

[1] اس سے مراد کوئی "آسمان سے آنے والا" نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظامِ ملت اور اس کا مرکز ہے۔
[2] پاکستان کا خطۂ زمین (جسے ۱۹۴۷ء میں) انہی حسین آرزوؤں کے تصدق حاصل ہوا تھا۔

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

سلیم کے نام خطوط

(تین جلدوں میں)

یہ حقیقت کشا خطوط قلبِ سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جاں نواز تحریک ہیں۔ مفسرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص، دلکش، شگفتہ اور آسان فہم اندازِ نگارش۔ تینوں جلدیں خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہیں۔

قیمت۔ جلد اول۔ آٹھ روپے — جلد دوم چھ روپے — جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ طلوعِ اسلام، ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بقیہ سفر نقیبِ بہار صفحہ سے آگے

...طاقتوں کا دماغ کچھ دیکھ اور ادراک کر سکتا تھا لیکن دل ان کے رموز کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ گھڑی آگئی ہے جس کی اقبال نے تمنا کی تھی۔

ع آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

کتنے ہی ساتھی پرانے تھے کتنی ہی نئی روحیں اس کاروانِ بہار میں تازہ وارد تھیں۔ بسلسلۂ فکر و عمل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مختلف شہروں کے ترجمان سامنے ڈائس پر آئے۔ اپنے جب رفیق کا نام لیتے، وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا اور ترجمان بیچ بیچ اُس کے احوال و کوائف کی ترجمانی کرتا۔ شیخ محمد شفیع صاحب نے کراچی کے دوستوں کا تعارف کرایا۔ شفیع صاحب آہستہ آہستہ مقرر بنتے جاتے ہیں یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وہ اتنے اختصار کے ساتھ شخصیتوں کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ دو تین جملوں میں جیسے وہ آئینہ سا تعمیر کر دیتے۔

سب کونشن کے داعی حسینی صاحب نے ہمارے میزبانوں سے ہم کو ملایا۔ حیدرآباد میں اگرچہ بزم باقاعدہ طور پر قائم نہیں ہو سکی ہے لیکن شریکِ راہ اور ہم سفر کتنے ہی نوجوان ہیں۔ ہمارے میزبانوں میں زیادہ تر نوجوان اور طالب علم ہی تھے۔ ان میں سے دو "بوہرے" تھے۔ ابھی ہم سب ایسی ہی تفریقوں کا شکار ہیں۔ خدا کرے یہ امتیازی خطوط جلد قرآنی سمندر میں ڈوب جائیں۔ اس وقت تو یہ حالت ہے کہ ان تفریقات سے بلند ہو کر حصارِ قرآن میں آنے والے کے سامنے بڑی بڑی دیواریں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ برادری کے طعنے، سماجی بائیکاٹ، مقاطعے۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ لیکن یہ بہار جسے ایمان کہتے ہیں بھلا ایسی بندشوں کو کہیں خاطر میں لاتا ہے۔ پھر تو ہر سو وحدتِ آدم اور لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں آنے لگتی ہیں۔

نظام بخش صاحب آئے۔ اپنا ذکر کرتے ہوئے شرما رہے تھے۔ دو چار باتیں کہیں، دو چار بار اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر یار محمد طلال صاحب کا تذکرہ کیا اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ کل رات میں اس الجھن میں مبتلا تھا کہ ان کی داڑھی مجھے اتنی پسند کیوں آئی۔ اس اجتماع میں مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ اُن کی داڑھی کا طول و عرض سرسید احمد خان کی شبیہ اور ریش مبارک کی یاد دلا رہا تھا۔

مجھے سیالکوٹ کے نوجوان نمائندے نے بے حد متاثر کیا۔ اور آج میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ مجھے اُس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ اُس نوجوان نے اپنے اور اپنے رفقائے کار کی جانب سے ایک پیغام پڑھ کر سنایا۔ اُس پیغام کی ہر سطر میں "سوز و سازِ رومی" اور "پیچ و تابِ رازی" ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر سطر خلوص کی خوشبو سے معطر تھی۔ قرآنی آیات کے اشاروں اور مستقبل پر یقین نے اس تحریر کو بڑا جاندار بنا دیا تھا۔

تعارف کے بعد قرار دادوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اپنی اپنی جگہ پر لوگ جو کچھ سوچتے رہے تھے آج اُس کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے خلوص پر اتنا یقین تھا کہ تنقید کرتے ہوئے الفاظ کے پردوں میں اپنے حقیقی جذبات کو چھپانے کی کسی نے بھی کوشش نہ کی۔ ان قرار دادوں پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو "بزم ہائے طلوعِ اسلام کی مرکزی مجلس عاملہ کی تشکیل کرے گی، فکرِ قرآنی کو آگے بڑھانے کی سبیلیں نکالے گی اور غالباً ایک مرکزی اشاعتی ادارہ قائم کرے گی۔ یہ اجلاس کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اس اجلاس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ پرویز صاحب نے شاید ہی کسی مسئلہ میں اپنی رائے دی ہو۔ مندوبین کی نگاہیں بار بار اُن کی طرف

اٹھتی تھیں اور بار بار پرویز صاحب کا تبسم اُن کو یہی پیغام دیتا تھا کہ "خود سوچو! اپنے مسائل پر غور کرو" کسی مفکر اور ذہنی رہنما کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اُس سے وابستہ ہونے والے اپنی فکر سے محروم نہ ہونے پائیں بلکہ خود سوچنا شروع کریں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان کی فکری اور ذہنی تاریخ میں اکتا دینے والی یکسانیت ہوتی۔

آخر میں پرویز صاحب نے سب کنونشن کے پیچھے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس خطاب کا انداز ہی جداگانہ تھا۔ یہ وہ پرویز صاحب نہیں تھے جو طلوعِ اسلام پر "ہم عقل" "محض حافظ" ہوا نہیں۔ بلکہ وانش نورانی بھی) نظر آتے ہیں۔ اس خطاب میں تو اُن کا ہر لفظ دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ بقول اُس علامہ کی طرح پرفشاں تھا جو "فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور" کا نغمہ بلند کرتا ہوا آسمانوں کی بلندیوں کی طرح مائل پرواز ہو۔ اگر کوئی مالی شاداب و طیور کا پودا لگائے اور قوانین فطرت اپنی رفتار کو برق رفتاری عطا کرتے ہوئے اس کی زندگی ہی میں اُس پودے کو قد آور درخت میں بدل دیں تو اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ — (یہ بڑا عجیب سا سوال ہے۔ تحریکیں بھی تو اپنے بانی نظریاتیوں کے نزدیک شاد و طیور کا پودا ہوتی ہیں لیکن خلوص عمل اور یک جہتی کی انسانی قوتیں خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہو کر اُس پودے کی جڑوں کو زمین کی گہرائیوں میں پیوست کر دیتی ہیں اور شاخیں فضا پہ چھا جاتی ہیں) — تو پرویز کی کیفیت اسی مالی کی سی تھی۔

اپنے خطاب میں انہوں نے فرمایا کہ "سندھ کی سرزمین برصغیر کے لئے باب الاسلام کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی خاک کو محمد بن قاسم اور اس کے رفقاء نے ہمارے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ مغیروں اسلام کی پہلی کرنیں اسی مطلع پہ جگمگائی تھیں۔

سابق سندھ تک ہماری یہ تحریک بہت دیر میں پہنچی ہے۔ اس میں کوتاہی ہماری ہے لیکن اب جب اس تحریک کا آغاز یہاں ہو ہو چکا ہے، یقین ہے کہ قرآنی فکر کی ترویج کی یہ تحریک نئے رنگ و بو پیدا کرے گی۔ اس کی بہار رسا مانی اور حیات آفرینی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ کھجور کا درخت حجاز کی مقدس سرزمین کی طرح سندھ کی زمین کے لئے بھی ایک علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ پنپنے کے لئے بڑی مدت چاہتا ہے۔ چالیس سال کے بعد اس میں پھل آتے ہیں لیکن پھر اس کی ثمرداری کی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی۔ صدیاں بیت جاتی ہیں اور کھجور کا درخت گردشِ شام و سحر کے درمیان جواں رہتا ہے۔ اس خطۂ زمین پر کتنے ہی ایسے درخت ہیں جو محمد بن قاسم کے ساتھیوں کے مبارک ہاتھوں سے لگائے تھے۔

انشاء اللہ طلوعِ اسلام کی یہ تحریک کھجور کے درخت کی طرح پھلتی پھولتی رہے گی۔ قابلِ مبارک باد ہیں حسین صاحب جن کے ہاتھوں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ اور در خور ستائش ہیں بزم کراچی کے ترجمان اور اراکین جن کے تعاون سے یہ اجتماع اس قدر کامیاب ہوا۔ جب وطنِ عزیز قرآنی نظام کی تابانیوں کا گہوارہ بنے گا تو ان احباب کی اس خدمت کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔"

پہلی نشست کے بعد سندھ میں دسمبر کا یہ قافلہ باتیں کرتے ہوئے اور اپنا احتساب کرتے ہوئے کراچی ہوٹل پہنچا۔ ہمارا قیام ہوٹل کے پاس ہی تھا۔ چند قدم درمیان تھے۔ یہ بھی خوب جگہ تھی۔ خالد میموریل اسکول — جسے محترم ڈاکٹر تاتاری صاحب کے حسن تلطف نے اس مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد یاروں نے دس پندرہ منٹ اپنی کارستانی کی بابت اور پھر "دارالاجتماع" پہنچ گئے۔

سہ پہر کا یہ اجتماع سوالات و جوابات کے لیے مخصوص تھا۔ سوچنے والوں کے لئے تو زندگی کا ہر لمحہ بے شمار سوالات لے کر آتا ہے۔ اُن میں سے بہت سے سوالوں کا جواب آدمی کو اپنی ذات سے مل جاتا ہے۔ کچھ سوالات مطالعہ اور دوستوں کی مدد سے حل ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ مسئلے کسی کی رہنمائی کے محتاج رہتے ہیں ـــــ طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کے وابستگانِ دامن ایسے ہی مسائل کے حل کے لئے سالانہ اور علاقائی کنونشن کو غنیمت موقع سمجھتے ہیں۔ پرویز صاحب مسکراتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے ایک ایک گرہ کو کھولتے جاتے ہیں تو گویا نسیم سے غنچے کھلتے جاتے ہیں۔ سوالات کی سطح اور معیار کافی بلند تھا۔ جس سے ارباب طریق کے طرزِ فکر کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ "انسانی ذات اور عقل کے فرق" اور "خوارقِ عادات" پر اچھے سوال کئے گئے اور پرویز صاحب نے بڑی تفصیل سے ان پر بات کی۔

مجھے اس روداد میں پرویز صاحب کے خطاب کراچی کو ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اس لئے اس "مقامِ شوق" (سوال و جواب) سے آسانی سے گزرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ روداد آپ تک نومبر کے طلوعِ اسلام کے ذریعہ پہنچ جائے۔

۱۷ اکتوبر کو "ہم میں کیرکٹر کیوں نہیں" کے موضوع پر سندھ آرٹس کالج میں پرویز صاحب کا خطاب تھا۔ "شاہین بچوں" کی محفل ہو تو پرویز صاحب کی نگاہوں میں جیسے ابدیت مسکرانے لگتی ہے۔ انہیں جوانوں کے لئے وہ اپنی دعائے نیم شبی کو مخصوص سمجھتے ہیں۔ انہیں جوانوں کو وہ اپنی آہِ سحرگاہی میں یاد کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنی "جوانی" میں انہوں نے اپنے لئے دعائیں مانگی ہوں، مگر اب وہ اس دعا کے سوا کسی اور دعا سے آشنا نہیں کہ ؎

جوانوں کو آہِ سحر بخش دے ۔۔۔ مرا عشق، میری نظر بخش دے

اسی لئے پرویز صاحب اس پروگرام سے بہت خوش تھے۔ سندھ آرٹس کالج، حیدرآباد کے پرنسپل مرزا عابد عباس (خدا کرے میں نے نام ٹھیک ہی لکھا ہو) کی اخلاقی جرأت اور وسیع قومی نقطۂ نظر نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مفاد پرستوں نے گزشتہ بارہ سال میں ہر ممکن کوشش کی ہے کہ پرویز صاحب کی آواز (جو درحقیقت قرآنی آواز ہے) نوجوانوں تک نہ پہنچنے پائے کیونکہ ان کے ذہن مفاد پرستی اور تعصب سے خالی ہوتے ہیں اور ان کے دل کی لوح ہر اس نقش کو قبول کر لیتی ہے جسے علم، عقل اور وجدان کی بارگاہ سے معقولیت کی سند مل جائے۔ کسی "قومی" کالج کے پرنسپل کے لئے جس کا ان حضرات سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہو، اس درجہ ذہنی جرأت قابلِ صد ستائش ہے۔ اس سے یہ امید تو بندھتی ہے کہ ہماری بعض درسگاہوں میں جو نئی پود پروان چڑھ رہی ہے ابھی اس پر مختلف افکار کے دروازے بند نہیں کئے گئے ہیں۔ اسے تنقید اور غور و فکر کی آزادی حاصل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے مختلف آراء کے مفکرین سے قریب تر آنے اور انہیں سمجھنے کے مواقع حاصل ہیں۔

سات بجے جلسہ کا آغاز ہوا۔ پرنسپل صاحب نے ایک بڑی متوازن تمہیدی تقریر کی جس میں انہوں نے طلباء کو بتایا کہ "تعلیم کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ آپ اپنی فکر کی تربیت میں مصروف رہیں۔ ہر نقطۂ نظر کا مطالعہ کریں اور اپنے لئے آپ نتائج مرتب کریں۔ پرویز صاحب کے افکار سے بہت سے لوگ اختلاف کرتے ہیں، لیکن اس سے اُن کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے دور کے ایک اہم مفکر اور قابلِ قدر شخصیت ہیں۔ آج اُن کی تقریر کسی ایسے موضوع پر نہیں جسے کوئی متنازعہ قرار دے سکے۔ یہ ایسا موضوع ہے

جس پر آج کے حالات میں غور کرنا بہت ضروری ہے اور یہ بات ہمارے لئے باعثِ فخر ہے کہ ہمیں پرویز صاحب کی زبانی اُن کے خیالات و افکار سننے کا یہ موقع ملا ہے"؟

سٹی آرٹس کالج کا وسیع احاطہ کرسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمام نشستیں تقریباً پُر تھیں۔ اجتماع میں طلباء کی اکثریت تھی اور غالب اکثریت۔ پرویز صاحب لکھنے اور بولنے کے ایک خصوصی اسلوب کے مالک ہیں۔ اُن کی تحریر اور تقریر پر اُن کی ذات اور شخصیت کی مُہر لگی ہے۔ علومِ حاضرہ کے بلند ترین موضوعات اور قرآنِ حکیم کی حکمت کو وہ علمی لیکن بے حد حسین پیرائے میں اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر آج کی تقریر میں وہ "سہلِ ممتنع" کی طرف مائل تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ فکر و نظر اور اسالیب کی دُنیا میں ایسے "معجزے" کبھی کبھی رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ "ستم ظریف" جس کا اسلوب کبھی یہ تھا کہ ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

آخر وہی، اِن نغموں کا بھی تو خالق تھا ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

غالبؔ کی یہ تبدیلی "خارجی تحریک" کا نتیجہ تھی۔ اور آج پرویز صاحب کو بھی اِس بات کا احساس تھا کہ اِن طلباء میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے جو اُردو جانتے تو ہیں لیکن اُس کے علمی پیرائیوں کی لذّت سے آشنا نہیں ہیں۔ سادہ الفاظ میں بڑی اور گہری بات کہنا "لانا ہے جوئے شیر کا"۔ اور پرویز صاحب کامیاب و بامراد اِس منزل سے گزر گئے۔ یہ بھی قرآن کے تیس سالہ مطالعہ کا فیض ہے۔ اُس کتاب کا عکس اور اثر جو ایک طرف عرب کے بدوؤں کو تمدن آشنا کر گئی اور دوسری طرف جس کی سطح کا یہ عالم ہے کہ ہر دَور اُس کے ارشادات کو کسی آنے والی منزل کا "سنگِ منزل" قرار دیتا ہے۔ الفاظ کی سادگی، بلیغ تمثیلوں اور مثالوں کے ساتھ مل کر "قیامت" بن گئی۔

اِس موضوع پر پرویز صاحب کے بنیادی افکار و تصورات میں اُن کے گذشتہ دَورۂ کراچی کی سرگزشت کے سلسلہ میں قلمبند کر چکا ہوں۔ پرویز صاحب نے بڑے منطقی تسلسل کے ساتھ بتایا کہ کردار کی تعریف میں علمائے اخلاقیات کس طرح اور کس قدر نا کام رہے ہیں؟ مشرق و مغرب میں اخلاقی تصورات کس قدر اضافی ہیں؟ ایک ہی قدر کے معنی کتنے مختلف ہو جاتے ہیں؟ اور ذہنِ انسانی خود مستقل اقدار کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ مستقل اقدار تو صرف وحی الٰہی کے ذریعہ مل سکتی ہیں۔ وہی مستقل اقدار کیرکٹر کی بنیاد ہیں۔ ہم ذرا نچلے درجہ کے مفاد پرست ہیں۔ حیوانی سطح کے مفادات کے لئے مستقل اقدار جیسے مفادات کو بھول جاتے ہیں۔ وہ مفادات جن سے صرف جسم کی نہیں بلکہ ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُن کی حقیقت ہمارے دلوں میں اُتری نہیں ہے۔ جس دن ہم نے یہ بات سمجھ لی اُسی دن ہم میں کردار پیدا ہو جائے گا۔ اِس حقیقت اور مستقل اقدار پر اِس مستحکم یقین کو "ایمان" کہتے ہیں۔[1]

---

[1] یہ کیرکٹر کے عنوان پر پرویز صاحب کا خطاب جو زیرِ اشاعت ہیں شائع ہو رہا ہے۔

جب تقریر شروع ہوئی تھی تو جلسہ گاہ سے کسی قدر دور پیچھے چند طلباء "طالب علمانہ تمسخر" کی کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن آواز تو ان تک پہنچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُن میں سے بیشتر سامعین کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ جوانی اور طالب علمی تھوڑی سی غیر ذمہ دار ہو سکتی ہے لیکن نہ تو اُس کے قلب پر تعصبات کی مُہر لگی ہوتی ہے، نہ کان حق بات سے بھاگتے ہیں۔

جب تقریر ختم ہوئی تو معلوم ہوا جیسے یہ طالب علم اسی لمحہ کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک اور منظر نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ ایک سندھی بزرگ بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ اُن کے گرد دو آدمی عقیدت مجسم بن کر موجود تھے۔ جلسہ ختم ہوا اور وہ صاحب میرے قریب سے گزرے، اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ "اِن باتوں پر سوچنا چاہئے۔ ہر بات بڑی لاجواب کہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کوئی ایسی پتے کی باتیں کرتا ہے" اُس دن مجھے اپنی سندھی دانی پر پہلی بار فخر کا احساس ہوا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک نوجوان آ کر اُن "بزرگ" کے قدموں سے لپٹ گیا (سابق سندھ میں یہ رسم آج بھی جاری ہے)، وہ محصول نے اُسے بڑے پیار سے اُٹھا کر گلے سے لگایا۔ اور ابھی سے قرآن کہتے ہیں کہ وہ "مذہبی بزرگ" ہوں گے، وڈیرے نہیں۔ واقعہ سیدھا سادہ ہے مگر کئی عجیب نکتے اِس سے وابستہ ہیں۔ ایک تو مذہبی پیشوا، دوسرے عمر پچاس سے زیادہ، تیسرے اپنے پیشہ کے مفادات۔ لیکن سچ اپنے آپ کو کیسے منواتا ہے۔ ہزار دل برکتیں ہوں اُن پر جن کو حق اپنے اظہار کے لئے چن لیتا ہے

سب کونش تو ۱۹ اکتوبر کو ختم ہو گیا تھا، لیکن زیادہ تر مندوبین وہیں ٹھہرے ہوئے تھے، اسی تقریر کی خاطر۔ اس آخری اجتماع کے ساتھ حیدر آباد کا پروگرام ختم ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خالد میموریل اسکول (قیام گاہ) خالی ہو گیا۔

پرویز صاحب حیدر آباد تک آئیں اور کراچی اُن کے دائرہ سفر میں شامل نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔ اسی شہر سے تو یہ ابر اٹھا ہے جو اب سارے دیس پہ برس رہا ہے۔ ہر کوہ و دمن اور ہر دشت و جبل پر — کراچی اس تحریک قرآنی کا گہوارہ ہے، اس شہر سے پرویز صاحب کے کتنے ہی رفیقوں کی یاد وابستہ ہے۔ کتنے ہی گنج ہائے گراں مایہ جو خاک کراچی کی گود میں سو گئے۔ کتنے ہی رفیقان کہن جو اپنے دلوں میں دنیائے تازہ کی تخلیق کی خاطر پرویز صاحب کو پیتے ہی درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو ہر بار پرویز صاحب کو رخصت کرتے ہوئے آنسوؤں کی زبان میں کہتے ہیں۔

؎ ہزار بار بِرو، صد ہزار بار بیا

۱۸ اکتوبر کو پرویز صاحب کراچی پہنچے۔ ۱۹ اکتوبر کی بات کو کراچی کے واحد اجتماع کا تعلیم کیا گیا، لیکن شفیع و دیگر صاحبان کا مکان بھی تو "دوارالاجتماع" بن گیا، دو تین دنوں کے لئے — پرویز صاحب دو پہر تک مجھے بھی نہیں ملے، ریکارڈ چھتے ہوں لکھ رہے ہیں کہ اصحاب آگئے بات کر رہے ہیں کہ فون آگیا — اور پرویز صاحب یہاں کراچی میں ہر شخص کو اپنی شفقت و محبت سے منور کر رہے ہیں۔ کوئی ناگوار بات ہوئی، کسی نے بے وقت مداخلت کی، چہرے پر ایک لکیر ابھری، پیشانی کے ایک گوشہ سے ناگواری کی لہر اُبھری لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ تبسم میں بدل گئی۔ اور پرویز صاحب یہ کہتے ہوئے اقبال کا یہ مصرعہ گنگنانے لگے

؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رہی ملزم حق و باطل میں اُن کی فولاد صفتی۔ سو گزشتہ چھیں سال کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ لے لیجیے۔ طلوعِ اسلام کا کوئی شمارہ دیکھ لیجیے۔ پرویز کی کسی کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ لیجیے ۔ یہ پہلو ہر جگہ نظر آ جائے گا۔

۱۹ / اکتوبر کو کنونشن ہال میں ساڑھے نو بجے رات کو پرویز صاحب کا درسِ قرآن تھا۔ سورۃ "والعصر" کی تفسیر "نجاتِ انسانیت" کے زیرِ عنوان۔ پرویز صاحب آج کل اپنے ہفتہ وار درسوں میں ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر پیش کر رہے ہیں۔ انسان کی قوتِ تسخیر کے صدقے، کراچی والے بھی ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ ہر اتوار اس سلسلہ سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اس لئے کونشن کے درس میں لوگوں میں یہ جذبہ تھا کہ تسلسل برقرار رہے ۔

کراچی کا سب سے بڑا ہال آدمیوں سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے راگ سے باجا۔ بھواریوں سے جنتی معاشرہ ۔ ناہمواریوں سے ہمارا سماج ۔۔۔ پرویز صاحب نے ٹھیک وقت پر اپنی تقریر شروع کر دی۔ میں اُن کی کتنی ہی تقریروں کا ذکر آپ کو سنا چکا ہوں۔ کتنی ہی تقریروں کے خلاصے آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں لیکن آج کی تقریر۔ یہ تو "چیزِ دیگر" تھی۔ پرویز صاحب کی بہترین تقریروں میں سے ایک۔ ہر لفظ فکر و جذبہ کی ترشی ہوئی صورت ۔۔۔ "والعصر ان الانسان لفی خسر" کی بار بار تکرار نے وہی کیفیت پیدا کر دی جو سورۂ رحمٰن کی تلاوت سے طاری ہوتی ہے۔ اقبال نے تو بندۂ مومن کی زندگی کے لئے بھی یہی کہا ہے ۔ ؎

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

اور آج مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ یہ آہنگ تو قرآن کی ہر سورۃ میں ہے۔ لیکن اس آہنگِ حقیقی کی تفہیم کے لئے الفاظ و معانی کو ہم رشتے کرنا پڑتا ہے۔ جب غالب صاحب اپنے چھوٹے سے دیوان کے سمجھنے کے لئے ہم سے زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال کی قربانی مانگتے ہیں تو قرآن کریم کے حقائق کا یہ تقاضہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اگر پیغاماتِ ربانی کو سمجھنا ہو تو اپنے دور کے علوم کی سطح تک اپنے آپ کو لے جاؤ اور پھر قرآن کے حقائق کو پرکھو۔ یا انسانی تاریخ پر نظر ڈالو اور دیکھو تو قرآنی اندازِ زیست کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ پرویز صاحب کی یہ تقریر تہذیبِ مغرب کا ایسا تجزیہ تھا جو مغربی مفکرین کے ہزاروں صفحات سے زیادہ روشن تھا۔ مغرب کے مفکر اپنی تہذیب کے کھوکھلے پن سے آگاہ ہیں۔ شدت کے ساتھ، لیکن اس صورتِ حال کو بدلا کیسے جائے یا یہ بنیاد اُن کے پاس نہیں ہے ۔

"قرآن کا دامن پھیلتا جا رہا ہے" اور میں اس فکر میں غلطاں ہوں کہ اس تقریر کا خلاصہ کس طرح پیش کروں ۔ تقریر میں سے کچھ چھوڑتا ہوں تو ربط ٹوٹتا ہے۔ پوری لکھتا ہوں تو طلوعِ اسلام کی تنگیِ داماں عناں گیر ہو جاتی ہے ۔۔۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ یہاں بھی، دیگر مراحل کی طرح، پرویز صاحب کی دستگیری آڑے آئی۔ انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ تقریر کو خود منضبط کر کے اگلے پرچے میں شائع کر دیں گے۔ بزرگِ ما آپ سے، میری مشکل کس آسانی سے حل ہوئی ۔

پرویز صاحب جب اپنی تقریر میں عصرِ حاضر کے انسان کی تباہی کا نقشہ کھینچ رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہماری دنیا

پیمانوں کی تاریخی نسبتوں میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ ہم سب ایک آتش فشاں کے کنارے کھڑے اندھیرے کے عالم میں اس کی چنگاریاں اڑتی دیکھ رہے ہیں۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے ہیں اور ان بادلوں کی کوکھ میں پانی نہیں آگ ہے، دہکتی ہوئی آگ۔

لیکن جب انہوں نے اس جہنم سے نجات کا راستہ بتایا تو یوں نظر آیا گویا ابو آدم کو وہ فردوس گم گشتہ پھر سے مل گیا جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے مارا مارا پھر رہا تھا۔ جب تقریر ختم ہوئی تو میری زبان پر بے ساختہ اقبال کا یہ مصرع آ گیا کہ

اے بندۂ مومن! تو نذیری، تو بشیری

پرویز نے اندھیروں میں اجالے کے خواب دیکھے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اندھیری رات انسانیت کا مقدر نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے تاریکیوں میں آنسوؤں کی شمعیں جلائی ہیں تاکہ مسافر راستہ نہ بھولنے پائیں۔

وہ تیس سال سے ہمارے درمیان جاگ رہا ہے۔ وہ ان کی تلاش کر رہا ہے جو جاگنا چاہتے ہیں تاکہ پھر یہ اپنے تعاون سے ساری دنیا کو جگا دیں۔ اس طویل مدت میں پہلے اس کے پیغام کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی --- اور اب جب زندگی کے افق پر سنگین حقائق کے سورج کی تمازت بڑھتی جا رہی ہے، لوگ اس کے پیغام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

ان ساتھیوں کا خلوص مسلم اور معتبر سہی لیکن شاید ابھی رفتار سفر بہت آہستہ ہے۔ انسان تیز چلے تو قوانین فطرت برق رفتاری سے اس کا ساتھ دیتے ہیں اور

نے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

غالباً اپریل ۱۹۶۱ء میں طلوع اسلام کا سالانہ کنونشن لاہور میں منعقد ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت ہم میں سے کتنے پرویز کے سامنے اپنے آپ کو شاہد بنا کر یہ بات کہہ سکیں گے کہ "میں جاگ رہا ہوں اور ان کا متلاشی ہوں جو جاگنا چاہتے ہیں۔"

(بقیہ صفحہ ۱۲) صدرِ مملکت نے پاکستان کے مستقبل کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اقبال کے اس شعر کا حسین پیکر ہے:

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری　　نہ اس میں عہدِ کہن کا فسانہ و افسوں

یہی وہ مقام ہے جس کا گہوارہ ہمارا دیس بنے گا۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا

خدا کرے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی پختہ فکری، ان کی پختہ کاری کے ساتھ مل کر اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا درجہ حاصل کر لے اور جب مستقبل کا مؤرخ پاکستان کے انقلاب اور اس کے روحِ رواں کا ذکر کرے تو اسے یہی کہنا پڑے ؎

خوشا آں قومے پریشاں روزگارے　　کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے
ظہورش نعمتے از اسرارِ غیب است　　نہ ہر قرنے بروں آید سوارے